دِلّی دُور اَست

عطاالحق قاسمی

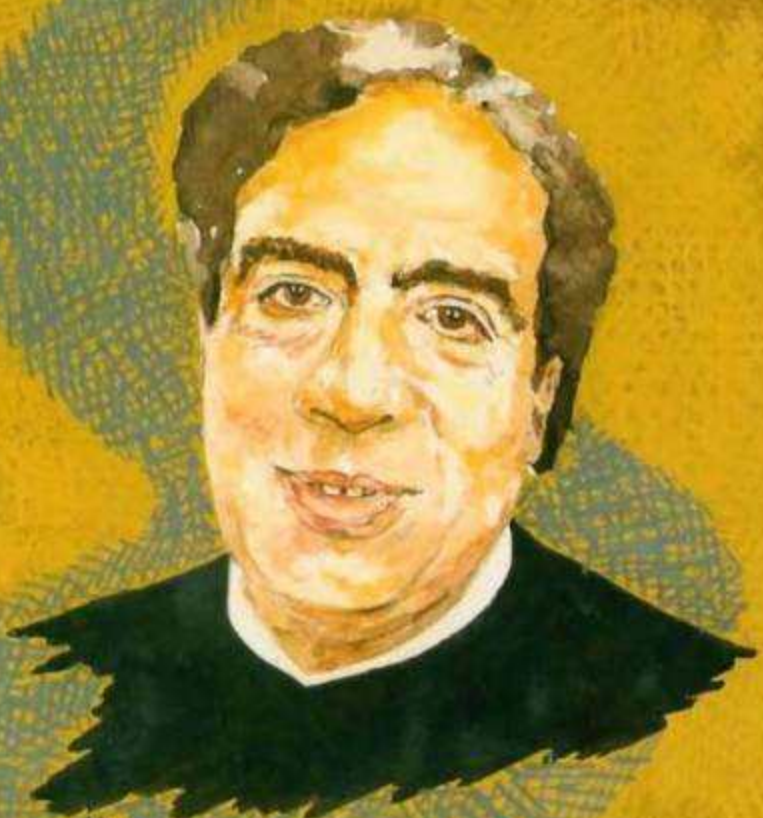

دِلّی دُور اَست

عطاالحق قاسمی

جہانگیر بک ڈپو، اُردو بازار، لاہور

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سال اشاعت 1998ء
ناشر ..... نواز نیاز
مطبع ..... نیاز جہانگیر پرنٹرز، لاہور
قیمت 150روپے
سٹاکسٹ ..... جہانگیر بکس، کمیٹی چوک
راولپنڈی، فون 539609

انتساب

"دیوان اختر" والے
اختر سعید کے نام

Optimized by www.ImageOptimizer.net

1977ء

خواب اور حقیقت کے درمیان پہلا سفر

امرتسر جنت گم گشتہ

پیغام مجھے یہ موصول ہوا تھا کہ 15/ فروری کو صبح نو بجے واتا دربار پہنچنا ہے جہاں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عرس میں شرکت کے لیے سرہند شریف جانے والی زائرین کی جماعت کو دستار بندی سے فراغت کے بعد بسوں میں واہگہ بارڈر تک لے جایا جائے گا اور پھر وہاں سے بھارتی بسیں انہیں امرتسر لے جائیں گی۔ امرتسر سے سوا پانچ بجے جنتا ایکسپریس ملے گی جو رات کو ساڑھے دس بجے سرہند پہنچاوے گی!

پروگرام اتنا منضبط اور بندھا ٹکا تھا کہ حضرت مجددؒ کی بارگاہ میں حاضری کی خوشی کے ساتھ ساتھ مجھے اپنا ایک خواب بکھرتا بھی محسوس ہوا۔ خواب یہ تھا کہ سرہند روانگی سے قبل میں ایک دن امرتسر میں گزاروں گا۔ امرتسر جو میری جنم بھومی ہے اور جسے میں نے شعور کی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں چار سال کا تھا کہ پاکستان بن گیا اور میری ماں میری انگلی پکڑے مجھے اس سرزمین پر لے آئی جس کی خاک میری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ میں نے امرتسر کو شعور کی آنکھوں سے نہیں دیکھا، مگر دل کی دھڑکنوں میں محسوس کیا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اپنے گھر والوں سے امرتسر کا ذکر کچھ اس تواتر اور وارفتگی سے سنا تھا کہ وہ شہر بن دیکھے میرے خیالوں میں سما گیا تھا۔ رہی سہی کسر اے حمید کے افسانوں نے پوری کر دی تھی۔ قیام پاکستان سے قبل تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کے مرکز اس شہر کے بارے میں میرے ذہن میں جو نقشہ ابھرتا تھا وہ ایک مڈل کلاس کشمیری گھرانے کی فضا سے مستعار تھا۔ کیونکہ امرتسر میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد کشمیر سے یہاں آکر آباد ہوئی تھی۔ سیب ایسے گالوں والی لڑکیاں، دہکتے ہوئے چہروں والے خوبصورت مرد، کشمیر سے محنت مزدوری کی تلاش میں آئے ہوئے ہاتو جواہرات کے سوداگر، ماہر فن رفوگر، شالوں کے تاجر اور اس کے علاوہ سمادار کانگڑیاں، کھنڈ

کلچے اور شب دیگ! میرے ذہن میں یہ سب چیزیں ترتیب پاکر امرتسر بن جاتی تھیں۔ پھر یہاں کے گلی کوچے میرے خوابوں میں بسے ہوئے تھے۔ وہ کوچے جنہیں میں نے دیکھا نہیں تھا صرف ذکر سنا تھا۔ گلوالی دروازہ جہاں ہم رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھگتاں والا دروازہ' ہال بازار' شریف پورہ' کٹڑہ کمہاراں! مجھے یہ گلی کوچے طلسماتی سے لگتے تھے۔ میرے ذہن میں اس مکان کا نقشہ بھی تھا جہاں میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ سندر سا' خوبصورت سا! صحن کے اوپر کمک ہو گا جہاں سے بارش کے دوران بوندیں' کرنوں کی طرح چھن چھن کر گرتی ہوں گی۔ وہ خوبصورت سی مسجد جہاں میرے دادا مفتی غلام مصطفےٰ قاسمی خطیب تھے۔ "چاچا ام کلو" جو ہمارا پرانا موذن تھا۔ کشمیر سے علم دین کے حصول کے لیے آئے ہوئے طالب علم جو مسجد ہی میں رہتے تھے اور ہالہ بنا کر میرے دادا سے کشمیری زبان میں درس حدیث لیتے تھے اور ان طالب علموں کے ساتھ میرے ذہن میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی جوانی کی شبیہ نظروں کے سامنے گھومتی تھی جو میرے دادا کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ مجھے ان گلی کوچوں میں ——— سعادت حسن منٹو' صوفی تبسم' ظہیر کاشمیری' عارف عبدالمتین' شورش کاشمیری' احمد راہی' اے حمید' احمد مشتاق' سیف الدین سیف' شہزاد احمد اور مظفر علی سید کی بچپن اور جوانی کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ امرتسر جو مجھے امی کے حوالے سے بھی ذہن نشین تھا۔ ان کی زبان پر ہر وقت امرتسر کا ذکر رہتا تھا اور وہ اس کی برتری کے بیان کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں' حتیٰ کہ کبھی بارش ہوتی' تو وہ کہتیں! یہ بھی کوئی بارش ہے ٹپ ٹپ ٹپ! بارش تو "امبر سر" (امرتسر) میں ہوتی تھی' کیا دھاریں باندھ باندھ کر مینہ برستا تھا ——— میرے لیے امرتسر ایک سہانے خواب کی طرح تھا اور میں یہ خواب جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا' مگر زائرین کی جماعت کے لیے تیار شدہ پروگرام یہ بتا رہا تھا کہ ہمیں صرف امرتسر کے اسٹیشن پر رکنا ہو گا اور یوں میں وہ گلی کوچے نہیں دیکھ سکوں گا جن کی فضا چشم تصور میں مجھے نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سرمئی بادلوں کی طرح محسوس ہوتی تھی۔

"جلسہ تقسیم دستار"

میں زائرین کی جماعت کے ساتھ جا رہا تھا' سو میں نے اٹیچی کیس میں شلوار کرتوں کی تہیں جمائیں' بستر باندھا اور رکشے میں بیٹھ کر داتا دربار پہنچ گیا۔ دربار کے باہر زائرین جمع تھے' ان میں زیادہ تعداد باریش لوگوں کی تھی۔ ایک زائر بلوچستان کے دور دراز علاقے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس عاشق صادق کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ تین چار نوجوان سندھ کے مختلف شہروں سے یہاں پہنچے تھے۔ گلزار وفا چودھری' صوبی اور میرا بھانجا امجد بخاری مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں نے ارد گرد ٹوپیاں ہی ٹوپیاں دیکھیں' تو اپنی برہنگی کا خیال آیا اور امجد کو ٹوپی خریدنے کے لیے بھیجا۔ ہم دربار کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور یہاں چاروں طرف عمدہ دیگیں تیار کرنے والے باورچیوں کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ اندر مسجد سے لاؤڈ سپیکر پر نعت خوانی ہو رہی تھی۔ میرے قریب کھڑے ایک زائر نے سر جھکا لیا اور کھڑے کھڑے جھومنے لگا۔ پولیس کا ایک سپاہی سرحد کے ایک مفلوک الحال پٹھان سے جوتے پالش کرا رہا تھا۔ اس نے فی سبیل اللہ پالش کرانے کے بعد پالش والا برش لے کر ٹوپی صاف کی اور پھر ٹوپی سر پر رکھ کر وہ بھی جھومنے لگا۔ ایک مست ملنگ فقیر نے مجھے کاندھوں سے جھنجھوڑا خدا کے نام پر ایک روپیہ! میں نے جیب سے ایک چونی نکالی اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے چونی گھما کر زمین پر دے ماری اور سرخ سرخ آنکھوں سے گھورنے لگا۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی' تو اس اللہ لوک نے آنکھ بچا کر وہ چونی زمین سے اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ دریں اثناء امجد ایک گول مول سی کڑھی ہوئی ٹوپی لے آیا۔ اتنی دیر میں لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا کہ تمام زائرین مسجد کے اندر آجائیں کہ دستار بندی شروع ہونے والی ہے۔ میں نے یہ ٹوپی سر پر رکھی اور جوتے باہر جمع کرا کر مسجد میں داخل ہو گیا!

مسجد کا اندرونی حصہ زائرین اور دیگر عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا' منبر کے قریب پارٹی کے لیڈر اور ڈپٹی لیڈر کھڑے تھے۔ ایک صاحب کے ہاتھوں میں زائرین کے ناموں کی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

فہرست تھی۔ وہ ان میں سے کوئی نام پکارتے اور اس کے حاضر ہونے پر دستار اس کے سر پر باندھنے کے بجائے گلے میں ڈال دیتے۔ یہ وہ دستار بندی نہیں تھی جس کے لئے میں کئی دنوں سے ایکسائٹڈ پھر رہا تھا' بلکہ یہ تو جلسہ تقسیم دستار' قسم کی کوئی چیز تھی ——— اور پھر دستار کے تصور کے ساتھ میرے ذہن میں سبز رنگ ابھرتا تھا' مگر یہاں جو دستاریں تقسیم ہو رہی تھیں وہ پنجاب کے میلوں میں نظر آنے والے لاچوں کی طرح رنگ برنگی تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ کناروں پر کرن اور گوٹا وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔ پارٹی لیڈر لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس صدیق چودھری تھے' انہوں نے اچکن شلوار اور ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ چہرہ ساتھیوں جیسا تھا اور بول چال میں بھی کھردرا انداز جھلکتا تھا! ان کی عمر پچاس سے اوپر تھی جس کی نشاندہی کنپٹی پر نظر آنے والے سفید بالوں سے بھی ہو رہی تھی۔ ان کے برابر میں ڈپٹی لیڈر تھے جو راولپنڈی کی ایک جامع مسجد کے بارسوخ خطیب تھے۔ انہوں نے سفید ریشمی چوغہ پہنا ہوا تھا' ان کے چہرے پر خاصی لمبی اور گھنی سیاہ ڈاڑھی تھی' جس کی تہہ میں چند سفید بال خضاب کی غیر مساوی تقسیم کا گلہ کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے برابر میں پارٹی کے دوسرے ڈپٹی لیڈر تھے جنہوں نے سر پر غالب نما ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی۔ ڈاڑھی سفید تھی اور چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں انگلش کے پروفیسر تھے اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ دستاریں تقسیم ہو رہی تھیں' لوگ دستاریں گلے میں ڈال کر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔

کس شیر کی آمد ہے

اتنے میں لاؤڈ اسپیکر سے ایک پیر صاحب کے نام کا اعلان ہوا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ال ہو ——— ال ہو ——— (اللہ ہو' اللہ ہو) کی گونج سنائی دی۔ یوں لگتا تھا بہت سے لوگ مل کر ذکر کر رہے ہیں۔ میری طرح تمام لوگوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ پیر صاحب جنہوں نے افغانی علماء جیسی دستار باندھی ہوئی تھی' ڈاڑھی میں سیاہ اور سفید بال ایک ہی تناسب سے تھے' رنگ گورا اور قد ٹھگنا تھا' چہرے پر عینک تھی اور طویل سیاہ جبہ اوڑھے ہوئے تھے' سر جھکائے چلے آرہے تھے' ان کے دونوں طرف مریدین تھے جو سر کو بائیں جانب

جھکا دیتے ہوئے ایک خاص آہنگ کے ساتھ ال ہو۔ ال ہو کر رہے تھے۔ منبر کے قریب پہنچ کر ذکر کرنے والوں میں سے ایک نے ہاتھ فضا میں بلند کیا' جس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ پیر صاحب نے دستار وصول کی اور جونہی وہ واپس مڑے' ہدایات دینے والے مرید نے دوبارہ ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر مریدین سر کو بائیں جانب جھکا دیتے ہوئے 'اللہ ہو' کے ورد کے ساتھ پیر صاحب کو اپنے گھیرے میں واپس لے گئے۔

چورانوے زائرین کے لیے دو بسیں منگوائی گئیں تھیں اور وہ باہر کھڑی تھیں۔ اس تقریب سے فراغت کے بعد زائرین کو بسوں میں بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ بس کے اندر بستر بند اور لوٹوں کی اتنی بھرمار تھی کہ بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے لیے راستہ بنایا اور ایک تنومند زائر کے بیٹھے سے بچی ہوئی تھوڑی سی نشست کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس دوران ایک بار پھر اللہ ہو کی گونج سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مریدوں نے سامان اٹھایا ہوا تھا اور پیر صاحب اللہ ہو کی 'ضرب' کے ساتھ دوسری بس میں سوار ہو رہے تھے۔ مرید انہیں واہگے تک چھوڑنے جا رہے تھے۔

واہگے کے راستے میں انتظامی سرگرمیاں زوروں پر نظر آئیں۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم واہگے کی سرحد پر تھے۔ ادھر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور دوسری جانب بھارت کا ترنگا سرنگوں تھا کہ بھارت کے صدر فخرالدین علی احمد کے انتقال کو ابھی دو دن ہی ہوئے تھے۔ پاکستانی پرچم بھی ایک روز کے لیے سرنگوں کیا گیا تھا۔ پاسپورٹ اور سامان وغیرہ کی چیکنگ کے بعد ہمارے قدم بھارتی سرزمین پر تھے۔ پیر صاحب کے مریدین' ان کا سامان اللہ ہو کے ورد کے ساتھ پاکستان کی سرحد کے آخری سرے تک چھوڑنے اور پھر ہاتھ چومنے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ پیر صاحب نے امداد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مایوس ہو کر اپنے مقدس ہاتھوں سے سامان اٹھا کر باقی زائرین کے ساتھ چلتے ہوئے بھارتی سرحد میں داخل ہو گئے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

آگیا عین لڑائی میں

پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نے زائرین سے پاسپورٹ حاصل کر لیے تھے اور انہیں مجموعی طور پر بھارتی امیگریشن کے عملے کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی کارروائی مکمل کر سکیں۔ دریں اثنا زائرین مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ سرحدی چوکی کے سامنے والے لان میں زمین پر پتھلا مار کر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ سیمنٹ کے بنچوں پر براجمان تھے اور ایک تعداد بسوں میں بیٹھی کمر سیدھی کر رہی تھی۔ ایک یورپین ٹورسٹ جوڑا دفتری کارروائیوں سے فراغت پانے کے بعد پاکستان کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اپنے بے ترتیب بالوں کو سلجھانے میں مصروف تھی۔ لگتا تھا اس جوڑے کو کئی دنوں سے نہانے کا موقع نہیں ملا۔ پاسپورٹ اور دیگر امور کی چیکنگ وغیرہ کے لیے دو علیحدہ علیحدہ میزوں پر متعدد افراد مامور تھے اور وہ خاصی تیزی سے کام بھگتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا' سو ایک زائر نے لان میں کھڑے کھڑے اذان دی اور پھر متعدد زائرین وضو کے لیے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ کچھ ہی دیر بعد صفیں سیدھی ہو گئیں اور امام صاحب نے نماز پڑھانا شروع کر دی۔ نیلی قمیضوں میں ملبوس نوجوان بھارتی مزدوروں کے لیے یہ منظر غالباً" نیا تھا' کیونکہ وہ باڑ کی دوسری طرف آن کر کھڑے ہو گئے تھے اور بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ زائرین کو رکوع اور سجدے کرتے دیکھ رہے تھے۔ کچھ زائرین ایسے بھی تھے جو وضو کے لیے پانی کی تلاش' میں نماز والی جگہ سے کافی دور نکل گئے تھے۔ نماز ختم ہوئی' تو وہ واپس آ گئے' غالباً" انہیں وضو کے لئے پانی نہیں مل سکا تھا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

میں پتھر کے بنچ پر بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اس کا رنگ گورا تھا اور دانت سرخ جس سے اس کی پان خوری کی علامات ظاہر ہو

رہی تھیں۔ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا' مگر اس نے سر پر ایک سبز رنگ کی مخملی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جس کے سامنے والے حصے پر ہلال کا نشان تھا۔ مجھے یہ ملا جلا پروگرام بہت دلچسپ محسوس ہوا۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پوچھا۔

آپ عطاء الحق قاسمی ہیں؟

جی ——— مگر آپ مجھے کیسے پہچانتے ہیں؟

تصویر اخبار میں چھپتی ہو' تو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوتی۔

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

میرا نام نواز ہاشمی ہے۔ مجھے جب پتہ چلا کہ آپ سرکاری حیثیت سے وفد میں شامل ہیں اور یوں ہمارے ہم سفر ہیں' تو بے حد خوشی ہوئی' چنانچہ میں دو روز قبل آپ کے گھر کا پتہ کر کے آپ سے ملنے کے لیے بھی گیا تھا' مگر ملاقات نہ ہو سکی!

اور پھر نواز ہاشمی نے میرا بازو تھاما اور لان کے اس حصے کی طرف لے گئے جہاں تین چار زائرین ایک دیگچی کے گرد جمع تھے اور ان سے باری باری تعارف کرایا۔

یہ یعقوب بھٹی ہیں' یہ خواجہ مجید ہیں اور یہ غاشو پہلوان ہیں اور غاشو پہلوان کے نام کے ساتھ انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا غاشو پہلوان ان کا اصل نام نہیں ہے' اصل نام محمد رمضان ہے۔ یہ تو ہم انہیں پیار سے کہتے ہیں۔

اس پر میں نے غاشو پہلوان کی طرف دیکھا۔ عمر تقریباً ستر پچھتر برس' چہرے پر سفید ڈاڑھی اور مونچھیں مونڈی ہوئیں۔ جسم صحت مند اور چہرے پر سخت جلالی کیفیت۔

ہاشمی کے بچے تم باز آجاؤ' غاشو پہلوان نے اپنی موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے نواز ہاشمی کو گھورتے ہوئے پاٹ دار آواز میں تنبیہہ کی' مگر اس تنبیہہ میں بے تکلفی اور پیار کا عنصر بہت نمایاں تھا غاشو پہلوان کی پنجابی میں لدھیانوی لہجہ جھلک رہا تھا اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ لدھیانے ہی کی "جم پل" ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ جوانی میں بڑا جید بدمعاش تھا' مگر حضرت کی درگاہ سے لوٹا' تو اس کی دنیا بدل چکی تھی' تاہم اپنے ڈیل ڈول' کرخت چہرے' پھڈا ڈالنے کی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

عادت اور پاٹ دار آواز کی وجہ سے وہ آج بھی اپنے ماضی کی تھوڑی بہت گواہی دیتا تھا۔ یعقوب بھٹی اور خواجہ مجید دونوں قدرے فربہ جسم و پست قد کے مالک تھے۔ خواجہ مجید کا خواجہ ہونے کے ناطے سے گورا ہونا لازمی تھا۔ اور ان کے گورے چہرے پر ننھی منی سیاہ ڈاڑھی تھی۔ یعقوب بھٹی کا رنگ سانولا تھا اور نواز ہاشمی کی طرح ان میں بھی پان خوری کی علامات خاصی واضح تھیں۔ یہ سب ہنس مکھ لوگ تھے' چنانچہ "ہم جنس" باہم پرواز کے لیے اس گروہ میں شامل ہو گیا اور تمام سفر کے علاوہ سرہند شریف میں بھی چھ روز انہی کی صحبت میں گزارے کہ

صحبت صالح ترا صالح کند

مگر یہ صحبت ہم میں کسی کو زیادہ صالح نہ کر سکی' کیونکہ اس کے لیے صحبت کنندگان کا بنیادی طور پر صالح ہونا ضروری ہے۔

ہوشیار پوری بزرگ کی ہوشیاریاں

کھانے سے فراغت کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور ارد گرد نظر دوڑائی۔ ذرا پرے جبہ و دستار والے پیر صاحب چند زائرین کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھے۔ زائرین کے چہروں پر مرعوبیت کے آثار تھے۔ امیگریشن کا عملہ ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک شریمتی سمیت بدستور کلفذات کی جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ پارٹی لیڈر جسٹس صدیق چوہدری کالی اچکن' سفید شلوار میں ملبوس اور جناح کیپ پہنے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے۔ ان کے ہاتھ ایک کھردرا سا عصا تھا' لگتا تھا کسی درخت سے موٹی شاخ توڑ کر خود بنایا گیا ہے۔ اس "ہوم میڈ" ڈنڈے کو زمین پر ٹیکتے ہوئے وہ زائرین کے لیے مخصوص دو بسوں میں سے ایک بس کی طرف چلے گئے۔ پیر صاحب مستقبل قریب میں حلقہ ارادت میں شامل ہونے والے متوقع مریدوں کے ساتھ متواتر محو کلام تھے۔ ان کا ایک بیگ برابر میں پڑا تھا۔ دائیں جانب ایک ٹک شاپ تھی' جہاں کافی' چائے اور اس طرح کی دیگر چیزیں دستیاب تھیں۔ میں نے بھارت میں اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں کا اندازہ لگانے کے لیے ٹک شاپ کا رخ کیا۔ یہاں دو لڑکیاں سیلز

گرل کے طور پر کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی تھیں اور میں نے اشیائے خورد و نوش کا اندازہ لگانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک کم عمری کے باوجود بال بچے دار لگتی تھی اور دوسری کے چہرے پر دوشیزگی کا حسن تھا۔ میں نے اس سے مختلف چیزوں کی قیمتیں دریافت کرنا شروع کیں۔ جن کا جواب اس کے بجائے بال بچے دار خاتون دیتی رہی۔ ایک بال بچے دار شخص کے سلسلے میں غالباً "پروٹوکول" کا یہی تقاضا تھا۔ جب میں نے قیمتیں جان لیں اور اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بھارت میں ارزانی بہت ہے تو مجھے اس بت کے ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"آپ پاکستانی ہیں؟" وہ مجھ سے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں سوال پوچھ رہی تھی۔

"یس میڈم!" میں نے اسکول کے بچوں کی طرح حاضری لگانے کے انداز میں جواب دیا کفر خدا خدا کر کے ٹوٹا تھا۔

"یہ اتنے سارے لوگ جو نظر آ رہے ہیں یہ بھی پاکستانی ہیں؟"

"ہاں! یہ بھی پاکستانی ہیں اور سرہند شریف جا رہے ہیں' وہاں ہمارے ایک دینی رہنما کا عرس ہے۔"

"یہ عرس کیا ہوتا ہے؟" دیوی نے پوچھا۔

"عرس کیا ہوتا ہے ——— ؟" میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیسے سمجھاؤں پھر میں نے لمبی چوڑی تفصیلات میں جانے کی بجائے کہا یہ ایک مذہبی رسم ہے' بس آپ یہ سمجھیں کہ ہم یاتری ہیں۔

"آپ پہلی دفعہ ہندوستان آئے ہیں؟"

"ہاں! مگر میری پیدائش امرتسر کی ہے!" میں نے جواب دیا۔

"واقعی؟" اس کے چہرے پر خوشگوار کیفیت ظاہر ہوئی۔ میں بھی امرتسر کی ہوں!

"اور میں ہوشیار پور کا ہوں!" ایک سیاہ ریش زائر نے میرے برابر میں پہنچ کر کھلی باچھوں کے ساتھ لڑکی کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں وہاں ———

"رب راکھا"۔ میں نے بال بچے دار خاتون اور دوشیزہ دونوں کو اس "ہوشیار پوری"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بزرگ کے سپرد کیا اور اپنی بس کی طرف دوڑا۔ ڈرائیور بس میں بیٹھ چکا تھا اور زائرین ایک ایک کرکے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ کاغذات کی جانچ پڑتال مکمل ہو چکی تھی۔ اس بار میں نے اپنی سیٹ بدل لی تھی اور خواجہ مجید کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ اتنے میں "ال ہو' ال ہو" کی مانوس آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو پیر صاحب شان سکندری کے ساتھ بس کی طرف آ رہے تھے۔ نئے مریدان کے جلو میں تھے اور ان میں سے ایک نے پیر صاحب کا بیگ اٹھایا ہوا تھا!

چاروں طرف سکھ ہی سکھ

بس نے ابھی رینگنا شروع ہی کیا تھا کہ ایک سکھ اے۔ ایس۔ آئی بس میں چڑھ آیا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مسافروں کی گنتی کرتے ہوئے ہنس کر کہا اس میں کوئی ہمارا آدمی تو سوار نہیں ہو گیا؟

"بس میں سے ایک زائر نے جواب دیا "یقیناً ہوا ہو گا مگر ہمارے علم میں نہیں" اس پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور بولا مہاراج آپ نے گنتی بھلا دی ہے۔ اب پھر سے گننا پڑے گا۔ اور پھر اس نے دوبارہ گنتی شروع کر دی۔ سردار جی نے گنتی پوری کی تو بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت پونے چار بجے تھے اور امرتسر یہاں سے صرف آدھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔

میں کھڑکی کی جانب بیٹھا تھا اور تیزی سے نظروں کے سامنے گزرتے ہوئے بھارتی علاقے کو بیک وقت حیرت و استعجاب' جوش وولولہ اور حزن واداسی کے ساتھ دیکھنے میں مشغول تھا۔ میں نے نیویارک' واشنگٹن اور پیرس بھی دیکھے ہیں' مگر ان شہروں کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے میں اس کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا' جو بظاہر اپنے ہی شہروں اور قصبوں جیسے ان علاقوں سے گزرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ وہ راستے تھے جدھر سے 1947ء میں خون میں ڈوبے ہوئے قافلے گزرے تھے' 1965ء اور 1971ء میں ان راستوں سے بارود کی چنگاریاں میرے وطن کی طرف لپکی تھیں اور 1947ء سے 1977ء تک

ایک عجیب قسم کی پراسرایت اور شک وشبہ کی گرد فضاؤں میں موجود رہی اور یہی وہ فضا تھی جس میں میری نسل کے افراد نے شعور کی آنکھ کھولی۔ اس کے ساتھ ساتھ امرتسر سے میری جذباتی وابستگی کی لہر بھی ان لہروں میں شامل تھی' جو اس وقت میرے ذہن میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی' چنانچہ میں بیک وقت حزن واداسی' حیرت و استعجاب اور جوش وولولہ کے ساتھ گردن موڑے کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر دیکھنے میں مشغول تھا۔ دائیں طرف ہرے بھرے کھیت اور کھیتوں میں رنگ برنگی پگڑیاں باندھے ہوئے سکھ کسان اپنے کام میں مشغول نظر آتے تھے پاکستانی پنجاب کا کسان عموماً سفید پگڑی باندھتا ہے' مگر واہگے کے اس طرف داخل ہوتے ہی ہر طرف نیلی' پیلی لال اور کیسری رنگ کی پگڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے پگڑی باندھنے کا انداز بھی ہم سے مختلف تھا۔ یہاں چاروں طرف سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر' پیدل چلتے ہوئے' ریڑھے میں سوار' قصبات کے ٹمپچر تانگوں میں' اپنی استریوں کے ساتھ! میں نے پاکستان میں سکھ یاتری اکادکا تو ضرور دیکھے تھے' مگر اتنے سارے سکھوں کو بیک وقت دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے اس تصور کے ساتھ گدگدی سی محسوس ہوئی' مگر دوسرے ہی لمحے اپنے اس احمقانہ استعجاب پر ہنسی آ گئی۔ اس وقت جس علاقے سے ہم گزر رہے تھے' وہ شہر اور دیہات کی ملی جلی آبادی پر مشتمل تھا' چنانچہ کبھی کھیت نظر آنے لگتے تھے اور کبھی دکانوں اور فیکٹریوں وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ سائیکلوں کی ایک دکان پر ایک افلاس زدہ سکھ بچہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ایک سائیکل میں ہوا بھرنے میں مشغول تھا' پمپ اس کے قد سے بڑا تھا چنانچہ وہ اچھل اچھل کر ہوا بھر رہا تھا۔ یہ دلخراش منظر سرحد کے دونوں جانب دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت سڑک کے کنارے چنے بھون رہی تھی۔ اس کے برابر میں پٹھوں کی دکان تھی' جہاں دو نوجوان ٹوکے سے چارہ کاٹ رہے تھے۔ ذرا آگے دکانوں کے قریب ایک سکھ نوجوان لنگوٹ باندھے' جوڑا کھولے ہینڈ پمپ کے نیچے نہانے میں مشغول تھا۔ یہ کھلے جوڑے والا سکھ بھی میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک دم سے میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"یہ کیا ہے" میں نے باہر کو ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ مجید سے پوچھا۔ جنہیں امرتسر کی طرف جانے والے ان راستوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ "یہ سوروں کا ریوڑ ہے' ان کے پیچھے چرواہا ہے۔" خواجہ مجید نے کچھ اتنے سکون سے بتایا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اپنی جوانی کا ایک حصہ انہوں نے اس معاشرے ہی میں بسر کیا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر باہر سے اپنی نظریں ہٹالی تھیں اور برابر میں بیٹھے نواز ہاشمی سے گفتگو میں مصروف ہو گئے تھے۔

واہگے سے تقریباً چار پانچ میل دور گریڈا کا گاؤں آیا۔ یہاں پرائمری اسکول میں بچوں کو چھٹی ہوئی تھی۔ وہ بستے گلے میں لٹکائے خوشی کے عالم میں شور مچاتے اسکول سے باہر آ رہے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں نے سرخ پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں اور وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ بچیوں نے سر پر چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹانگے اور سائیکل وافر تعداد میں نظر آ رہے تھے' جبکہ اس سارے راستے میں مجھے صرف دو کاریں نظر آئیں۔ کافی آگے جا کر بائیں جانب گرونانک یونیورسٹی کی نئی عمارت نظر آئی۔ اس سے ذرا آگے خالصہ کالج کی بلڈنگ تھی جس کی گھڑی سوا چار بجا رہی تھی۔ ہم امرتسر کے نواح میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد امرتسر اسٹیشن آنے والا تھا جہاں سے ہمیں امرتسر کی جھلک دیکھے بغیر جنتا ایکسپریس میں بیٹھ کر سرہند شریف کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔

یا خواجہ مدد کر

"خواجہ صاحب میں امرتسر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے دادا کی قبر پر جانا چاہتا ہوں۔ یہ شہر آپ کی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ کوئی سبیل نکالیے۔" میں نے خواجہ مجید سے کہا۔

آپ امرتسر دیکھ کر کیا کریں گے؟ خواجہ صاحب نے لاتعلقی سے کہا۔ ان کے انداز میں اتنی سرد مہری تھی کہ مجھے کپکپی سی محسوس ہوئی۔ "یوں بھی ہمارا ویزا صرف سرہند شریف کے لیے ہے۔ ہمیں امرتسر میں تھوڑے سے قیام کی اجازت بھی نہیں مل سکتی۔"

ذرا آگے پتلی گھر کا قصبہ تھا اور اس کے سامنے امرتسر ریلوے اسٹیشن کی سرخ عمارت

نظر آ رہی تھی۔ ہماری بس نے ایک موڑ کاٹا اور اسٹیشن کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ زائرین بسوں سے اتر رہے تھے اور اب پوری رفتار کے ساتھ اپنا سامان نیچے اتار رہے تھے۔

"سو کے پچاسی ——— سو کے پچاسی سو کے پچاسی"

بڑھی ہوئی شیو والا ایک شخص میلی کچیلی دھوتی میں ملبوس ہاتھوں میں میلے کچیلے بھارتی نوٹ لیے آواز لگا رہا تھا۔ سو کے پچاسی! بعض زائرین خفیہ طور پر ساتھ لائے ہوئے پاکستانی سو روپے' بھارتی پچاسی روپوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ پنجاب وقف بورڈ کے سیکرٹری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی زائرین کے استقبال کے لئے یہاں موجود تھے۔ یہاں اسٹیشن پر وقف کی طرف سے زائرین کو استقبالیہ دینے کا پروگرام تھا اور پھر سوا پانچ بجے سرہند کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یعنی ابھی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

میری آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی میں امرتسر میں ہوں۔ اگر میں امرتسر میں ہوں تو پھر اس سے دور کیوں ہوں؟ میں چار سال کا تھا جب میں نے اس کی ہری بھری گود خالی کی تھی۔ یہ شہر آگے بڑھ کر پیار کرنے کی بجائے مجھے اجنبیوں کی طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔ کیا یہ میرے جذبوں سے ناواقف ہے؟ پیشتر اس کے کہ میرے ہونٹ ایک بار پھر جنبش کرتے' خواجہ مجید نے میری آنکھوں میں جھانکا اور تھرتھرائی آواز میں کہا:

آپ کو اپنے دادا کی قبر پر پھول چڑھانے ہیں؟ آپ کو یہ شہر دیکھنا ہے؟ آئیے! میں آپ کو لیے چلتا ہوں۔ آپ کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ شہر دیکھیں میں آنکھیں ڈھانپ کر آپ کے ساتھ چلوں گا۔

خواب جو بکھر گیا

وفد کے ڈپٹی لیڈر (شیخ صاحب) اپنی غالب نما ٹوپی قمیض پاجامہ اور ہوائی چپل میں ملبوس بسوں سے سامان اتروانے میں مشغول تھے۔ خواجہ مجید نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور ان کے پاس لے گئے۔ "شیخ صاحب انہیں یہاں اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جانا ہے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

انہیں رستوں کا علم نہیں ہے۔ میں ذرا ساتھ جارہا ہوں ہم ابھی لوٹ آئیں گے۔" خواجہ صاحب نے غالباً" مناسب سمجھا تھا کہ وفد کے کسی ذمہ دار رکن کے نوٹس میں یہ بات لے آئیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے" شیخ صاحب نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے چندھیائی چندھیائی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر گاڑی چھوٹنے میں بہت تھوڑا وقت ہے۔ ابھی یہ سامان اتروانا ہے' پھر اسے پلیٹ فارم تک پہنچانا ہے اور اس کے بعد گاڑی میں رکھوانا ہے۔ آدھ پون گھنٹہ تو اسی میں صرف ہو جائے گا' آپ لوگ باقی پندرہ بیس منٹ میں کیسے جائیں گے اور کیسے واپس آئیں گے؟"

شیخ صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے' لیکن مجھے یوں لگا میرے خواب ایک بار پھر بکھر گئے ہیں۔ میں اپنا امرتسر نہیں دیکھ سکوں گا۔ خواجہ مجید نے میری کیفیت بھانپ لی۔ انہوں نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کو واپسی پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ میرا اٹل وعدہ ہے آیئے! اس وقت عصرانے میں شریک ہوتے ہیں اور پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر عصرانے میں لے گئے۔ عصرانے میں تقریریں تھیں چائے تھی اور امرتسر ٹیلیویژن والے تھے جو ایک زائر کا کلوز اپ لے رہے تھے جس نے ایک کیلا منہ میں اور چار پانچ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے صدیوں کی بھوک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی میں نے کچھ دیر وہاں قیام کیا اور پھر درمیان میں سے اٹھ کر مضمحل قدموں کے ساتھ پلیٹ فارم پر آگیا جہاں سرحد کو جانے والی جنتا ایکسپریس ابھی ابھی آن کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں زائرین کے لیے ایک بڑی بوگی مخصوص کر دی گئی تھی میں اس میں داخل ہوا اور چپ چاپ ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں باقی زائرین بھی پہنچ گئے اور دھکم پیل کرتے ہوئے گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ گارڈ نے ان میں سے ایک زائر کو خوشی مزاجی سے کہا۔ "مہاراج! آپ آرام سے سوار ہوں' جب تک آپ حکم نہیں دیں گے گاڑی نہیں چلے گی!" کاش! گارڈ نے یہی بات مجھ ہجر نصیب سے کہی ہوتی!

ایشیا سرخ ہے

سوا پانچ بجے گاڑی پٹڑیاں بدلتی اور اس سے پیدا ہونے والے مخصوص آہنگ کے ساتھ شہر کی حدود سے نکل رہی تھی۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بے گھر لوگوں کے کچے آباد تھے۔ انہوں نے پٹڑی کے ساتھ بالکل برابر میں چولہے جلائے ہوئے تھے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس عورتیں کھانا پکانے میں مشغول تھیں۔ ان کے نیم برہنہ بچے کھیلتے کھیلتے ساکت کھڑے ہو گئے تھے اور برابر سے گزرتی ہوئی گاڑی میں سوار آباد گھروں کے مکینوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے دن میں ایسی کئی گاڑیاں گزرتی ہوں گی اور وہ انہیں دیکھنے کے لیے اسی طرح ساکت کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور اب وہ فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ ہمارا ڈبہ زائرین اور ان کے سامان سے اٹا ہوا تھا۔ چنانچہ میں اپنی سنگل سیٹ پر ترچھا بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایک باریش بزرگ تشریف فرما تھے جنہوں نے سفید چادر کی بکل ماری ہوئی تھی اور اسی چادر سے گھونگھٹ سا نکال رکھا تھا۔ وہ گردن جھکائے خاموشی سے ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ بائیں جانب والی لمبی نشست کے کونے پر ایک نوجوان سردار جی براجمان تھے جو امرتسر ہی سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور جن کا نام بلدیو سنگھ تھا۔ ان کا رنگ سانولا تھا۔ سر پر سرخ پگڑی سرخ چھینٹ والی قمیض اور سرخ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اگر سردار جی کو ایشیا تصور کر لیا جائے تو پھر یہ واقعی سرخ ہے البتہ انہوں نے سویٹر زرد رنگ کا پہنا ہوا تھا اس زرد سویٹر سے مجھے گمان گزرا کہ شاید ان کا تعلق صحافت سے ہے لیکن گفتگو ہوئی تو وہ خاصے قریبی محکمے یعنی پولیس کے نکلے میں نے پوچھا سردار جی! آپ نے بھی کبھی کسی ملزم کو چھینٹی لگائی ہے؟"

"آہو جی" سردار جی نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا" روزای لائی دی اے (روزانہ ہی لگاتے ہیں)

Optimized by www.ImageOptimizer.net

نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ

پیشتر اس کے کہ سردار جی سے سلسلہ گفتگو دراز ہوتا راجہ عدالت خاں اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے رازدارانہ انداز میں میرے کان میں کہا "ان لوگوں سے حتی الامکان گفتگو سے پرہیز کریں ہمیں سرکار کی طرف سے یہی ہدایت ہے"۔ میں نے جواباً ان کے کان میں اتنی ہی رازداری سے کہا میری سرکار! آپ بالکل بے فکر رہیں راجہ عدالت خاں داتا دربار سے یہاں تک چھوٹے چھوٹے معاملات میں اتنی باریکیوں سے کام لیتے چلے آرہے تھے اور ڈیکورم کا کچھ اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی تو ان پر عدالت کی بجائے عدالت عالیہ کا گمان گزرنے لگتا تھا راجہ صاحب غالباً" میرے جواب سے مطمئن ہو گئے۔ کیونکہ وہ اٹھ کر اپنی سیٹ پر چلے گئے اور میں نے سردار جی سے دوبارہ ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی تھی۔ ڈبے کے دونوں دروازوں پر ایک ایک "گن مین" کھڑا تھا۔ انہوں نے سروں پر جھالر والی سرخ پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔ دائیں دروازے والے سنتری کے پاس ایک پاگل کھڑا تھا جس کی ڈاڑھی بے طرح بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹیکر پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں خشک پھولوں کی ڈالی تھی۔ وہ ایک مقررہ وقت پر مسکرانے لگتا اور پھر یک دم چہرے کو کرخت بنا لیتا۔ اس کے چند ثانیوں بعد مقررہ وقت پر اس کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ ہمارے قافلے میں قاری خوشی محمد بھی تھے۔ وہ ڈبے کے آخری سرے پر بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے کانوں میں ایک مدھ بھری آواز ہولے ہولے اترتی محسوس ہوئی اور پھر یہ آواز پورے ڈبے میں پھیل گئی۔ قاری صاحب اپنی نشست پر بیٹھے باآواز بلند تلاوت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مصروف گفتگو ٹرین کی آوازیں مدھم ہوتے ہوتے خاموش ہو گئیں مگر کچھ ہی دیر بعد یہ آوازیں ایک بار پھر بلند ہوئیں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ڈبے میں پھیل گئیں دراصل اسلام آباد میں جمع کرائی گئی پاکستانی رقم کے بدلے زائرین میں بھارتی کرنسی تقسیم کی جارہی تھی اور زائرین اپنی نشستوں سے کود کود کر نوٹ تقسیم کرنے والے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ تلاوت نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ میں گم ہو گئی تھی میں نے گن مین کے برابر میں کھڑے پاگل کو دیکھا۔ ان لمحوں

میں اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر یہ مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیلتی چلی گئی۔

تم نے اپنی مونچھیں دیکھی ہیں؟

پونے چھ بجے جنڈیالہ کا دیہاتی اسٹیشن آیا اور گزر گیا۔ یہاں گندم اور کماد کی فصل تاحد نظر سر اٹھائے کھڑی تھی۔ تمام راستے میں میری آنکھوں نے ایک انچ زمین بھی ایسی نہ دیکھی جسے یہاں کے محنتی کسانوں نے گلزار نہ بنا دیا ہو۔ سوا چھ بجے گاڑی بیاس پہنچی میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ سو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے لگا۔ یہاں بہت سے لڑکے بالے بھی گاڑی سے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں کلپ والے پیڈ تھے۔ شاید وہ امتحان دے کر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں ایک دراز قد سکھ لڑکا بھی تھا جس کے چہرے پر ننھی منی ڈاڑھی تھی۔ جب وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اسٹیشن پار کرنے کے لیے پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو ٹکٹ کلکٹر نے اسے پکڑ لیا۔

"یہ تم نے اپنی ڈاڑھی دیکھی ہے؟ ٹکٹ کلکٹر نے چبھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھی ہے کیا ہوا؟" لڑکے نے پریشانی سے ڈاڑھی کو انگلیوں سے ٹٹولا۔

"اور اپنی مونچھوں پر غور کیا ہے؟"

"کیا ہوا مونچھوں کو ٹھیک تو ہیں!" نوجوان نے گھبراہٹ کے عالم میں مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"اور یہ ٹکٹ دیکھا ہے؟ ٹکٹ کلکٹر نے اسے ٹکٹ لوٹاتے ہوئے کہا۔ "آدھی ٹکٹ پر سفر کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی!"

گاڑی ایک بار پھر اپنی منزل کی جانب چل پڑی تھی۔ قاری خوشی محمد اس بار کچھ زائرین کے ساتھ باآواز بلند "ذکر" میں مشغول تھے' جب ان کے ساتھیوں کی آواز مدھم پڑنے لگتی تو کہتے پوری طرح "ضرب" لگائیں کیفیت پیدا ہونی چاہیے۔ اور یہ فقرہ انہیں ہر دو منٹ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بعد کہنا پڑتا کچھ دیر بعد انہوں نے ذکر کا سلسلہ ترک کیا اور نعتیں پڑھنا شروع کر دیں حاضرین انکی طرف متوجہ نہیں تھے' اس پر قاری صاحب نے چار و ناچار ایک سردار جی کو پاس بلایا اور اسے ہیر سنانا شروع کر دی ادھر مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا' چنانچہ زائرین نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ وہ یہ فریضہ اپنی نشستوں پر بیٹھے بیٹھے اشاروں سے انجام دے رہے تھے۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پلیٹ فارم پر نماز ادا نہ کریں۔ "اللہ ہو" کے ورد کے ساتھ مریدوں کے جلو میں چلنے والے پیر صاحب بھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں اٹھا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"آپ بھی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ" پیر صاحب نے تعارف کے بعد اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا "جس گھر میں مشائخ گزرے ہوں' وہاں اطمینان رہتا ہے!"

پیر صاحب سے کچھ دیر گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ خاصے باخبر بزرگ ہیں۔ نئے اور پرانے علوم سے واقف ہیں۔ ان کی بات میں تاثیر بھی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے میں ان کی گفتگو سے متاثر ہوتا چلا جا رہا ہوں ناگاہ میری نظر ان کے سلیپر پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل مجھ میں سرہند شریف کے اسٹیشن سے درگاہ تک ان کا سلیپر اٹھا کر چلنے کی سکت نہ تھی!

جناح ایکسپریس اور جناح

جناح ایکسپریس سات بجے جالندھر اسٹیشن پر کھڑی تھی حفیظ جالندھری اور ضیاء جالندھری کا "گراں" آ گیا تھا۔ اردو کتابوں کی تلاش میں پلیٹ فارم پر اترا۔ یہاں صرف ایک بک اسٹال "سوویٹ بک لینڈ" نظر آیا۔ میں نے مطلوبہ کتابوں کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں' لیکن یہاں سرے سے اردو کی کوئی کتاب ہی موجود نہ تھی' چنانچہ میں نے "پرتاپ" اور "ٹریبیون" کو غنیمت جانا اور انہیں بغل میں دابے' پلیٹ فارم پر اپنی نشست کے سامنے کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھے بزرگ اسی طرح سفید چادر

کی بکل مارے ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ اسٹیشن پر موجود لوگوں کو علم ہو گیا تھا کہ اس ڈبے میں پاکستانی سفر کر رہے ہیں' چنانچہ انکی ایک بڑی تعداد مختلف کھڑکیوں کے سامنے جمع ہو گئی تھی اور زائرین سے گپ شپ میں مشغول تھی۔ دیگر زائرین کی طرح میرے سینے پر بھی پاکستان کا "بیج" تھا۔ یہ بیج دیکھ کر تین چار ہندو نوجوان جن کی عمریں سترہ سے بیس برس کے درمیان تھیں' میرے گرد جمع ہو گئے اور پاکستان کے بارے میں اشتیاق بھری گفتگو کرنے لگے وہ خصوصاً لاہور کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ لاہور ان کا "کریز" بنا ہوا ہے۔ وہ لاہور ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور "نیلام گھر" کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ریڈیو کا تلقین شاہ بھی انہیں بہت اچھا لگتا تھا اور مہدی حسن تو ان کی کمزوری تھے۔ لاہور کی باتیں کرتے کرتے اچانک ان میں سے ایک نے کہا سنا ہے جس روز امرتسر ٹیلی ویژن سے فلم لگتی ہو لاہور میں تمام کاروبار بند ہو جاتے ہیں!"

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس روز "مغل اعظم" دکھائی گئی اس روز لاہور کی سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں۔ ٹرینوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی' کیونکہ فلم دیکھنے کے لیے دوسرے شہروں سے لوگ لاہور آ رہے تھے۔ کیا یہ واقعی درست ہے؟"

"ہاں کافی حد تک درست ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر ان میں سے ایک نوجوان نے کھڑکی کی طرف بیٹھے ہوئے بزرگ کو کاندھوں سے ہلایا' انہوں نے چہرے سے سفید چادر سرکائی' تسبیح ہاتھ سے رکھی اور ملائمت سے پوچھا "کیا بات ہے برخوردار؟"

نوجوان نے بھولپن سے پوچھا! آپ نے "مغل اعظم" دیکھی تھی؟ کیسی تھی؟" یہ سن کر بزرگ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے پیار سے اس کے کاندھوں کو تھپتھپایا اور سر جھکا کر دوبارہ ذکر میں مشغول ہو گئے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اس گفتگو کے دوران ایک ادھیڑ عمر شخص دوبارہ ہمارے قریب سے گزرا اور تیسری بار وہ ہمارے درمیان آن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ان نوجوانوں کو گھورتے ہوئے کہا چلو بھاگو یہاں سے' کیوں ان بے چاروں کو تنگ کر رہے ہو تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے؟ اور پھر اس "سفید پوش" نے ایک چبھتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی' مگر گاڑی چلنے والی تھی میں اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا——— ڈبے کے دونوں دروازوں پر "گن مین" پہرہ دے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا یہ 77ء نہیں 71ء ہے اور پاکستانی جنگی قیدیوں کی ٹرین بھارتی علاقے سے گزر رہی ہے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ گن مین کے پاس کھڑے پاگل کے چہرے پر اس وقت گہری کرختگی تھی اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالے خشک پھولوں کی شاخ فضا میں لہرا رہا تھا۔

آپاں تے موجاں کر رئے ہاں

پونے نو بجے ہم لدھیانے پہنچ گئے۔ پلیٹ فارم پر ایک بک اسٹال پر نظر پڑی' تو میں ایک بار پھر کتابوں کی تلاش میں اس طرف لپکا' مگر یہاں بھی "ہند سماچار" اور "سپ سانجھ" کے علاوہ اردو کا کوئی رسالہ یا کتاب موجود نہ تھی۔ ہندی کتابیں اور رسالے البتہ وافر تعداد میں تھے' لیکن ان کی "وضع قطع" سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی نوعیت بہر حال ادبی نہیں ہے۔ کاؤنٹر کے پیچھے دو نوجوان کھڑے تھے پیارے لال اور رونق لال۔ رونق لال کے چہرے پر تو واقعی جوانی کی رونق موجود تھی۔ البتہ پیارے لال جوانی کی سرحد تقریباً عبور کر چکا تھا۔ اس نے تنگ مہری والی پتلون پہنی ہوئی تھی' قمیض کا کالر مڑا تڑا تھا' رنگ سانولا' چہرہ چوڑا' مونچھیں باریک اور آنکھیں نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ پیارے لال کو جب پتہ چلا کہ ہم پاکستانی ہیں' تو اس نے مارچ میں منعقد ہونے والے انتخابات کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا "نارمل طریقے سے ہو رہے ہیں!" یہ سن کر اس نے میرے برابر میں کھڑے قاری خوشی محمد کی طرف اشارہ کیا اور کہا "آپ اپنے ساتھی کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر رہے۔ آپ کے ہاں آمریت ہے اور اس کی وجہ سے آپ دونوں ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں واپسی پر

آپ دونوں میں سے کوئی حکومت کو رپورٹ نہ کر دے۔" اس پر میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بھارت میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد بھی آپ ہمیں یہ طعنہ دینے کی پوزیشن میں ہیں؟" یہ سن کر وہ ہنسا اور بولا "کونسی ایمرجنسی؟ ہم تو یہاں موجاں کر رہے ہیں۔" اور پھر اس نے پتلون کی جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور ادھر ادھر دیکھ کر ایک پیگ بنا کر میری طرف سرکایا' دوسرا اپنے منہ کے ساتھ لگایا اور کہا لو جی ذرا موج میلہ ہو جائے میں نے گلاس اٹھا کر اس کے ساتھی کی طرف سرکا دیا اور کہا شکریہ مگر میں نہیں پیتا۔ اس پر وہ ایک بار پھر ہنسا اور قاری خوشی محمد کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا آپ پھر اپنے ساتھی سے ڈر گئے ہیں۔

میں نے اس کی طنزیہ گفتگو سے صرف نظر کیا اور پوچھا "بھارت میں یوں کھلے بندوں شراب نوشی کی اجازت ہے یا آپ جرات اندانہ سے کام لے رہے ہیں؟" اس نے اپنا گلاس ختم کرنے کے بعد اپنے ساتھی کے سامنے دھرا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ "ہم تو یہاں موجاں کر رہے ہیں!" اس نے آستین سے منہ پونچھتے ہوئے کہا اور پھر دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

ہمارے ڈبے کے گرد ایک بار پھر نوجوان جمع ہو گئے تھے' ان میں سے ایک نوجوان ایسا بھی تھا جو کھڑے کھڑے ڈولنے لگتا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی تھیں' جنہیں وہ بڑی تگ و دو کے بعد کھولتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں ایک کارخانے میں فوج کے لیے ٹوپیاں بناتا ہے۔ اس کی بہن جالندھر سے اپنی بھانجی کی منگنی کے سلسلے میں شگن لے کر دہلی جا رہی تھی اور وہ اسے اسٹیشن پر ملنے آیا تھا' مگر وہ اس ٹرین میں نہیں تھی' غالباً کسی دوسری گاڑی میں دہلی چلی گئی تھی۔ یہ سب لوگ پاکستان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان خصوصاً لاہور دیکھنے کے شدید خواہش مند تھے اور پوچھ رہے تھے کہ وہ کس طرح لاہور آ سکتے ہیں؟ ان میں سے ایک سکھ نوجوان نے بتایا کہ اس کے والدین 1947ء میں لاہور سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے وہ خود اگرچہ لدھیانے ہی میں پیدا ہوا' مگر وہ لاہور دیکھنا چاہتا ہے' کیونکہ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اس کے گھر والے لاہور کا ذکر کچھ اس تواتر سے کرتے آئے ہیں کہ اس کے دل میں یہ آرزو بہت شدید ہو گئی ہے۔ اس نے کہا میرے پتا جی بتاتے ہیں وہاں ہمارے پاس پچاس بھینسیں تھیں جالندھر اسٹیشن والا "سفید پوش" جو ذرا پرے کھڑا تھا نوجوان کے اس اشتیاق کو بڑی تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آگے بڑھا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیلتے ہوئے بولا چلو چلو وہاں خواہ پچاس مرغیاں بھی نہ ہوں' کہتا ہے وہاں ہمارے پاس پچاس بھینسیں تھیں"

گارڈ نے وسل دے دیا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی' تو نشے سے بوجھل آنکھوں والا نوجوان ہمیں الوداع کہنے کے لئے آہستہ آہستہ بوگی کے ساتھ چلنے لگا۔ ابھی وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ لڑکھڑا کر گر پڑا' اس کا سکھ ساتھی اسے بازوؤں کا سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا!

خشک پھولوں کی ڈالی ہاتھ میں لیے مقررہ وقت پر مسکرانے اور پھر یک دم سنجیدہ ہو جانے والا پاگل یہاں اتر گیا تھا جتنا ایکسپریس ایک بار پھر فراٹے بھرتی ہوئی سرہند کی طرف گامزن تھی۔ بوگی سے نکلنے والی روشنیاں ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ بیشتر مسافر اونگھنے لگے تھے اور ان کی گردنیں ادھر ادھر لڑھک رہی تھیں۔ جسٹس صاحب نے اپنی نشست کے برابر میں مرشد کا دیا ہوا عصا رکھا ہوا تھا اور وہ راجہ صاحب سے ہمکلام تھے۔ یعقوب بھٹی' نواز ہاشمی اور خواجہ حفیظ حسب معمول اس رفتار سے پان خوری میں مشغول تھے کہ میں نے سوچا اگر پانوں کے کھیت میں انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے' تو یہ دو منٹ میں ساری فصل چٹ کر جائیں۔ وہ خواجہ مجید کو بھی بلا اصرار پان کھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب وہ نہ مانے تو ان میں سے دو نے انہیں بازوؤں سے پکڑا اور تیسرے نے گلوری ان کے منہ میں ڈال دی۔ غاشو پہلوان اپنے منڈے ہوئے سر اور منڈی ہوئی مونچھوں کے ساتھ برابر میں بیٹھا تھا اور اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھا۔ جس سے اس کی سفید داڑھی اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ اب سرہند شریف آنے کو تھا' کیونکہ زائرین میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے بستر

صندوق' بیگ اور لوٹے یکجا کر رہے تھے۔ گاڑی آہستہ ہو رہی تھی اور پھر وہ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی ہم سرہند پہنچ گئے تھے!

گرو جی نے کوئی منع نہیں کیا

اسٹیشن پر برائے نام روشنی تھی۔ ہم نے نیم تاریکی میں اپنا سامان پلیٹ فارم پر ایک جگہ جمع کیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ مقامی لوگ ہمارے استقبال کے لیے اسٹیشن پر جمع تھے اور "پاک ہند دوستی زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور پل کی سیڑھیاں طے کر کے ہم اسٹیشن سے باہر نکلے' تو ہماری نظروں کے عین سامنے ایک خوبصورت پنڈال روشنیوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ سرہند کے باسیوں نے یہاں ہمارے لیے چائے کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن اہتمام صرف چائے ہی کا نہیں تھا۔ طرفین کی طرف سے خیر سگالی پر مبنی تقریروں کا بھی تھا' چنانچہ یہاں سرہند کے ڈپٹی کمشنر مہندر سنگھ رنگیلا اور سنجے گاندھی کی قائم کردہ یوتھ کانگریس کے شیام لال نے سرہند کے شہریوں کی طرف سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہماری پارٹی کے لیڈر نے بھی آخر میں اپنی تقریر کے دوران اہالیان سرہند کی اس مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔

اس دوستانہ تقریب کے دوران میرے برابر میں ایک سکھ سپاہی کھڑا بڑے مزے سے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اسے ٹوکا' تو سردار جی نے کہا "کس گرو نے تمباکو نوشی سے منع کیا ہے؟" اس کے ساتھی نے جواب دیا' "گرو ارجن سنگھ نے" سردار جی نے بے نیازی سے کہا کوئی نہیں منع کیا! اور ایک بار پھر بیڑی کے طویل کش لینے میں مشغول ہو گئے۔

آستانہ حضرت مجدد الف ثانیؒ

چائے اور تقریروں سے فارغ ہو کر قصبے کے لوگوں کی طرف سے مہیا کردہ بسوں میں

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ہم درگاہ پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے تقریباً بارہ بجے تھے۔ روضے کا گنبد برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ باہر سڑک پر دوسرے شہروں سے آئے ہوئے دکاندار لکڑی کی عارضی دکانیں نصب کر رہے تھے۔ دروازے پر ہمارا استقبال درگاہ کے سجادہ نشین جناب سلطان احمد نے کیا۔ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد دونوں طرف حلوا پوری اور دیگر اشیائے خوردنی کی دکانیں نظر آئیں۔ ان عارضی دکانوں کے پیچھے قطار اندر قطار حجرے تھے' جن کے برآمدوں میں سینکڑوں زائرین' خواتین اور مرد پھٹے پرانے کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔ سو گز کے بعد ایک اور گیٹ آتا تھا۔ یہاں دینی کتب بیچنے والوں نے دونوں طرف اپنی دکانیں سجا رکھی تھیں۔ دائیں طرف سجادہ نشین صاحب کا مکان تھا اور بائیں طرف حجرے تھے اور ان کے برآمدوں میں بھی ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے بے آسرا مسلمان رضائیوں اور کمبلوں میں خود کو چھپائے ہوئے تھے۔ اس کے آگے روضے کا دروازہ تھا جہاں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ محو خواب تھے' جنہیں اقبالؒ نے ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان کہا ہے اور جو اپنے اعلیٰ ترین روحانی مدارج کے علاوہ در حقیقت دو قومی نظریے کے پہلے داعی تھے۔ انہوں نے اکبر کے "سیکولرازم" کا پردہ چاک کیا اور ہندی مسلمانوں کے دینی اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے نیز گھٹاٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں روشن کرنے کے لیے تمام عمر سخت ریاضت میں گزار دی!

ہم یہاں بہت دیر تک سونے کے لیے جگہ تلاش کرتے رہے بالآخر ہم نے ایک حجرے میں اپنا سامان رکھا جہاں پہلے سے چند لوگ موجود تھے اور زمین پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ تھکاوٹ سے ہمارے جسم ریزہ ریزہ ہو رہے تھے اور آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اس وقت رات کے قریباً "ڈھائی" بجے تھے اور صبح ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ تھی!

غاشو پہلوان نے ہم نیم خوابیدہ زائرین کو مخاطب کیا اور پاٹ دار آواز میں کہا میں فجر کے وقت تم لوگوں کو جگا دوں گا۔ اگر کسی نے اس وقت حیل و حجت سے کام لیا' تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا!

صوفی صاحب کی بے وزن شاعری اور مخبری

سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو اگلے روز قریباً" ایک سو پاکستانی زائرین پر مشتمل وفد سرہند سے قریباً" 20 کلو میٹر پر واقع ایک قصبہ براس کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرامؑ مدفون ہیں۔ زائرین کے لیے دو بسیں مخصوص کی گئی تھیں' مگر اس کے باوجود زائرین ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ مسافروں میں زائرین پر متعین بھارتی انٹیلی جنس کی فوج ظفر موج کے کچھ "معزز ارکان" بھی شامل تھے۔ مجھے ان میں سے خصوصاً" وہ "صوفی صاحب" بہت دلچسپ لگے تھے جنہوں نے لمبی داڑھی اور زلفیں رکھی ہوئی تھیں۔ سر پر گول ٹوپی تھی اور جو گذشتہ دو دنوں سے خصوصی طور پر مجھ سے "اظہار محبت" فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف سہارنپور کے لکڑی کے ایک بہت بڑے تاجر کے طور پر کرایا تھا اور "مور اوور" کے طور پر یہ بتایا تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں' چنانچہ انہوں نے گذشتہ رات ترنم سے اپنی کچھ بے وزن غزلیں بھی سنائی تھیں۔ ان صوفی صاحب کی حقیقت مجھ پر اس وقت آشکارا ہوئی جب دو روز قبل رات کو میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں تازہ ہوا کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مزار کے باہر عارضی طور پر قائم شدہ ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میرے حلق سے نکلنے والی آوازیں سن کر ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگے طبیعت بحال ہونے پر میں نے ان سے کہا "حضرت! آپ اتنی سردی میں باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟" فرمایا "بس نیند نہیں آ رہی تھی' یونہی ادھر چلا آیا" اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔ اس کے بعد رات کے دو بجے میں نے انہیں پھر اسی طرح تھڑے پر بیٹھے اونگھتے دیکھا اور پھر صبح چار بجے بھی وہ نیند نہ آنے کی وجہ سے" تھڑے پر مراقبے کے عالم میں تشریف فرما تھے اور اس وقت وہ پاکستانی زائرین کے لیے مخصوص بسوں میں سے ایک بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے "گھنگورا" مار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی' لیکن یہ آواز ان تک نہ پہنچی' شاید

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اس لیے کہ فروری کے مہینے میں چار پانچ روز تک فرش پر سونے کی وجہ سے گھنگورے میں وہ دم خم نہیں رہا تھا!

قصہ ایک بھنگی اور ایک سید زادی کا

میری نشست پاکستانی وفد کے قائد مسٹر جسٹس صدیق چوہدری کے ساتھ تھی۔ کھردری لکڑی سے تیار شدہ جسٹس صاحب کا عصا اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھا۔ بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو جسٹس صاحب نے اپنے خالص دیہاتی لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ میرے لیے ان کی یہ گفتگو حقیقتوں کا عرفان تھی۔ جسٹس صاحب قیام پاکستان کے بعد مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے قائم شدہ کمیشن کے رکن تھے اور اس عرصے میں انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ وہ بتا رہے تھے۔ "اس وقت تم سڑک کے دونوں جانب جو ہرے بھرے کھیت دیکھ رہے ہو 1947ء میں یہاں مسلمان عورتوں' مردوں اور بچوں کے سروں کی سرخ فصلیں کاٹی گئی تھیں۔ تم نے عورت کے کئی روپ دیکھے ہوں گے مگر اس کی بیچارگی اور مظلومیت کا رخ شاید اس طرح نہ دیکھا ہو جس طرح میں نے دیکھا ہے۔ جب مجھے پتہ چلتا کہ کسی گاؤں میں مسلمان عورتیں درندوں کے قبضے میں ہیں تو میں پولیس کے چند سپاہیوں کے ساتھ خون کے پیاسے افراد کے درمیان میں سے گزر کر ان تک پہنچتا' مگر کئی بار یوں ہوا کہ مغویہ ہمیں دیکھ کر ہمارے ساتھ چلنے کی بجائے اس وحشی کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی جس نے اس کے والدین کو قتل کر دیا تھا اور اسے اٹھا کر اپنے گھر ڈال لیا تھا۔ لیکن جب ہم اسے یقین دلاتے کہ اب وہ مکمل طور پر محفوظ ہے اور اسے اس غنڈے سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند ہوتی اور پھر مغویہ عورتوں کے کیمپ میں پہنچ کر وہ اپنے بچے کھچے کسی عزیز کے گلے لگ کر ہچکیاں لے لے کر روتی۔"

جسٹس صاحب نے بتایا "میری آنکھوں نے وہ خوں آشام مناظر دیکھے ہیں کہ ایک وقت میں انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میری ملاقات ان بچیوں سے بھی ہوئی جو پورے پورے گاؤں کی ملکیت تھیں۔ میں نے کیمپوں میں

اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور پھولے ہوئے پیٹ دیکھے ہیں۔ یہ اس وقت ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں' یہاں سے مسلمان عورتوں کے برہنہ جلوس گزرتے رہے ہیں!"

مگر میں تمہیں ایک واقعہ ضرور سناؤں گا۔ "جسٹس صاحب نے کہا" مجھے اطلاع ملی کہ ایک سید زادی کو ایک بھنگی نے اپنے گھر ڈالا ہوا ہے میں پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچا اور دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا صحن میں ایک بچی کھانا پکا رہی تھی اور ایک طرف جائے نماز بچھی تھی! اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک ادھیڑ عمر کا کالا بھجنگا شخص باہر نکلا اور ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی بھنگی تھا جس کے متعلق اطلاع ملی تھی اس نے ایک سید زادی کو اغوا کر کے گھر میں ڈال رکھا ہے اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور اپنی قمیض کے دامن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے اس نے کھانا پکاتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے نحیف سی آواز میں کہا۔ "تم اسے لینے آئے ہو؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ سیدھا لڑکی کی طرف گیا اور کہا "بیٹی! میرے پاس تمہیں الوداع کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پوٹلی میں ایک دوپٹہ ہے اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ سکھی رہو۔" اور پھر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مدد کے لئے پکارنے والی بیٹیاں

بس تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ براس کا قصبہ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں سے بے شمار بچے اچانک نکلے اور ہماری بس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس گاؤں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی چنانچہ ننھے ننھے بچوں نے سروں پر چونڈے کیے ہوئے تھے اور وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ زائرین بسوں میں سے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اترے اور قدرے بلندی پر واقع اس چار دیواری میں داخل ہو گئے جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرامؑ مدفون تھے۔ یہاں کئی کئی گز لمبی دو تین قبریں تھیں۔ جو مبینہ طور پر ان انبیاء کی تھیں زائرین نے یہاں قرآن مجید کی تلاوت کی اور دعا مانگی۔ دعا سے فراغت کے بعد بسوں کی طرف واپس جانے کے لیے ڈھلان سے اترتے ہوئے اچانک ایک دبلا پتلا سا ہندو ہمارے وفد کے قائد جسٹس صدیق چوہدری کے پاس آیا اور ان کے کان میں کچھ کہا اور پھر وہ شخص زائرین کے آگے آگے چلنے لگا جسٹس صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ ہندو انہیں بتا کر گیا ہے کہ سکھوں نے اس گاؤں میں بہت وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ انہوں نے سینکڑوں مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی تھی' بے شمار مسلمان عورتوں کو انہوں نے اپنے گھر میں قید کر لیا تھا جو آج بھی انہی گھروں میں بند ہیں اور ان کے بچوں کی مائیں ہیں۔ نیز یہ کہ سینکڑوں مسلمان لڑکیوں نے اپنی عزت بچانے کے لئے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور یہ کنویں ان کی لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ ان میں سے تین کنویں اس کے علم میں ہیں اور وہ ان کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے یہ خبر آگ کی طرح زائرین میں پھیل گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص کے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ہموار جگہ پر رک گیا جہاں خودرو پھول لہلہا رہے تھے۔ ان پھولوں کے نیچے وہ کنواں تھا جو بند ہو چکا تھا اور جس میں مسلمان لڑکیاں دفن تھیں۔ یہاں فاتحہ خوانی کرنے کے بعد زائرین کا یہ قافلہ ایک کچے مکان کے قریب جا کر رکا۔ اس مکان کی صحن کی دیوار کے نیچے دوسرا کنواں تھا جو مسلمان لڑکیوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا اور اب اسے بھی بند کیا جا چکا تھا۔ یہاں بھی فاتحہ خوانی کی گئی۔ تیسرا کنواں بہت سارے گھروں کے درمیان میں واقع تھا اور یہ اپنی اصل شکل میں موجود تھا۔ اسے بند نہیں کیا گیا تھا لیکن لاشوں سے پٹ جانے کی وجہ سے چونکہ اس کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا تھا' لہٰذا اب اس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ غم کی شدت سے زائرین کے کلیجے شق تھے اور آنکھیں ساون کی طرح برس رہی تھیں۔ خود مجھے یوں لگا میں 1977ء کی بجائے 1947ء میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے چشم تصور میں

دیکھا کہ جوان مردوں اور بوڑھی عورتوں کی لاشوں سے یہ میدان اٹا پڑا ہے اور وحشی درندے شراب کے نشے میں دھت بھیانک قہقہے لگاتے ہوئے بچیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اپنے والدین اور عزیز و اقربا کی لاشوں کو پھلانگتی ہوئی اس کنویں کے پاس آتی ہیں اور ایک ایک کر کے اس میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔ یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا ہے اور اس کا پانی کناروں سے بہنے لگا ہے اور پھر یہ بہتا ہوا پانی فریاد کے لیے اس چار دیواری کے نیچے جمع ہو گیا ہے جہاں انبیاءؑ کے مزار ہیں۔

یہاں وفد میں شامل ایک باریش بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر جوں جوں ان کی ہچکیوں بھری آواز بلند ہوتی گئی زائرین کی آہ و بکا میں شدت آتی گئی اور پھر روتے روتے گلے رندھ گئے۔ بھائی تیس برس بعد اپنی بہنوں کی خبر لینے آئے تھے اور پل بھر کے بعد انہوں نے پھر سے جدا ہو جانا تھا۔ ارد گرد کے مکانوں سے بہت سی ہندو اور سکھ عورتیں بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر یہ دلخراش منظر دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے پلو آنکھوں پر رکھ لیے تھے اور ان میں سے ایک عورت کو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر شدید کرب تھا اور وہ ایک ایک زائر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بے اختیار ہو کر اس نے چیخ ماری اور پھر وہ بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مجھے لگا یہ عورت ان میں سے ایک ہے جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں اور آنکھیں تارے لگی ہوئی ہیں۔

دعا سے فراغت کے بعد سندھ یونیورسٹی کے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا "یہاں آنے سے پہلے میں اکھنڈ بھارت کا قائل تھا اور سمجھتا تھا کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ میری یہ گزارش ہے کہ آپ واپس جائیں تو یہ تجویز پیش کریں کہ جو لوگ اپنے دلوں میں پاکستان کے حوالے سے کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں انہیں یہاں لا کر یہ کنوئیں دکھائے جائیں۔ یہ خونچکاں منظر نئی نسل کے ان افراد کو خصوصاً" دکھائے جائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان تاریخی عوامل کے بغیر بنا تھا۔ 1947ء کے بعد جنم لینے والی نسل کے افراد یہ کنوئیں دیکھ کر جان جائیں گے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے دارالامان پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ یہ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بھی جان جائیں گے کہ اگر اس ملک پر آنچ آتی ہے تو تلواریں ایک بار پھر ہوا میں لہرائیں گی اور بہنوں کی چیخ و پکار اندھے کنوؤں میں دم توڑ دے گی۔ اس سندھی نوجوان نے کہا کہ یہ کنویں ان بدنیت دانشوروں کو بھی دکھائیں جو پاکستانی قوم کے لیے یہ کنویں دوبارہ کھودنا چاہتے ہیں۔

واپسی پر ہندو اور سکھ بچے ایک بار پھر ہماری بسوں کے گرد جمع ہو گئے تھے اور معصوم نگاہوں سے ہمارے مغموم چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان میں سے تین چار سال کے ایک پیارے سے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "بیٹے تم تو معصوم ہو' یہ کنویں بھی معصوموں کی لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اگر تاریک طوفانی راتوں میں تم ان کنوؤں سے چیخیں سنو تو ان پر کان ضرور دھرنا۔ ہم یہ امانتیں تمہارے بڑوں کی بجائے تمہارے سپرد کر رہے ہیں کہ بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں۔"

کشادہ گھروں کے مکین

اور اب ایک دفعہ پھر ہمارا رخ امرتسر کی طرف تھا کہ یہاں سے ہم نے واہگہ کے راستے واپس اپنے وطن لوٹنا تھا اس وطن کی طرف جس کے لئے دی گئی قربانیوں میں سے ایک قربانی کے آثار نے ہماری آنکھوں کو ان کنوؤں میں رہن رکھ دیا تھا جو ہماری بہنوں اور بیٹیوں کی لاشوں سے پٹے ہوئے تھے!

امرتسر ریلوے اسٹیشن پر محکمہ اوقاف کی طرف سے الوداعی عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر مجھے اس عصرانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس شہر میں میرے بزرگوں کی قبریں تھیں اور ان کی روحیں تھیں جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے سرشاری کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔ بہاء الحق کا بیٹا ہماری خبر پوچھنے آیا ہے میں اپنے ان پیاروں کے دروازوں پر حاضری دیئے بغیر اس شہر سے کیسے جا سکتا تھا؟

میں جسٹس صاحب کے پاس گیا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی شاید اس لئے کہ اس وقت میں مجسم التجا نظر آ رہا تھا۔ جسٹس صاحب نے کہا "آپ خواجہ مجید کو ساتھ لے

جائیں لیکن ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس آ جائیں کہ یہ عصرانہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں چلے گا!"

ابا جی نے گھر کا پتہ نیز اس مسجد کا حدود اربعہ ایک کاغذ پر پوری وضاحت کے ساتھ مجھے لکھ کر دیا تھا' جس میں میرے دادا مفتی غلام مصطفےٰ قاسمی کی قبر تھی۔ میں نے یہ کاغذ خواجہ مجید کے سپرد کیا اور ان کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا جس کا رخ گلوالی دروازے کی طرف تھا!

امرتسر کی سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے ایک بازار مجھے بہت مانوس سا لگا' مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی خوشبو میرے اندر رچی بسی ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک دھندلی سی فلم چلتی محسوس ہوئی جیسے میں اپنے ابا جی کے کاندھوں پر سوار ہوں اور اس حیرت سے ارد گرد دکانوں پر بیٹھے لوگوں اور سڑکوں پر چلتے ہجوم کو دیکھ رہا ہوں جس حیرت سے چار سال کا ایک بچہ ان منظروں کو دیکھتا ہے۔

"خواجہ صاحب! یہ کون سا بازار ہے؟"

"یہ ہال بازار ہے" خواجہ مجید اسی سرد مہری سے جواب دیتے ہیں جو امرتسر کے ذکر کے ساتھ ان کے لہجے میں در آتی ہے۔

ہال بازار۔ ہال بازار؟ میں نے کتنی دفعہ یہ نام اپنے گھر والوں سے سنا ہے۔ کیا جادو تھا اس بازار میں کہ ہال روڈ اور انار کلی سے روزانہ گزرنے والوں کے لئے اس بازار کی کشش کئی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی آج میں اس بازار میں سے گذر رہا تھا' ایک گائے دکان کے باہر دھری بنولوں کی بوری میں منہ مار رہی تھی۔ ہندو دکاندار کے چہرے سے بے چینی نمایاں تھی۔ مگر وہ "گئو ماتا" کی شان میں کوئی واضع گستاخی نہیں کرنا چاہتا تھا خصوصاً" چلتے بازار میں کہ اس صورت میں دھرم کے علاوہ جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ انسان بھی کیسی عجیب مخلوق ہے' توہین کرنے پر اتر آئے تو اشرف المخلوقات انسان کی توہین کرنے سے باز نہیں آتا اور عزت کرنے پر تل جائے تو گائے' بھینسوں اور بندروں کی عزت بھی کرنے لگتا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کو سال میں کئی دفعہ ذبح کیا جاتا ہے اور بعض دفعہ تو اس لئے ذبح کیا جاتا

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ہے کہ انہوں نے گائے کیوں ذبح کی تھی؟

خواجہ مجید نے ایک میلی سی گلی میں رکشے والے کو رکنے کے لئے کہا۔۔۔۔۔۔ہم رکشے سے اترے تو ہمارے سامنے ایک مکان نما عمارت تھی جس کی ڈیوڑھی میں بھینس بندھی تھی اس مکان سے ملحقہ دکان ایک ڈاکٹر کی تھی جو سردار جی تھے۔

"یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں' میں پہلے اس مسجد کی زیارت کے لئے جانا چاہتا ہوں جہاں میرے دادا دفن ہیں" میں نے خواجہ صاحب سے کہا۔

"یہی وہ مسجد ہے" خواجہ صاحب نے ڈوبتی آواز میں کہا" آپ یہاں آنا چاہتے تھے نا اب آیئے میرے ساتھ 'اندر چلتے ہیں"

ڈیوڑھی میں سے گذر کر ہم مسجد کے صحن میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو میں نے دیکھا میرے دادا مسجد کی چٹائی پر بیٹھے ہیں ان کے گرد ان کے چہیتے شاگرد مولانا مفتی محمد حسنؒ (جامعہ اشرفیہ کے بانی) امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور کشمیر سے آئے ہوئے دوسرے طالبان علم ہالہ بنائے ہوئے ہیں, اور حدیث کا درس لے رہے ہیں۔ مجھے اپنے پورے جسم میں کپکپی سی محسوس ہوتی ہے' میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ میرے سامنے صحن کے اندر واقع سیڑھیوں پر سے ایک گیانی جی اتر رہے ہیں' وہ ہم پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالتے ہیں اور مقفل دروازہ کھول کر مسجد کے اندرونی حصے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

"یہ سب کچھ کیا ہے خواجہ صاحب؟" میں بے چینی سے پوچھتا ہوں

"یہ وہی کچھ ہے جو میں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں آپ کھڑے ہیں اب یہ مسجد نہیں' گردوارہ ہے!"

مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے کئی بم بلاسٹ ہوئے ہوں۔

مسجد کے اندرونی حصے میں سنگ مرمر کے ایک چبوترے پر گرنتھ صاحب رکھی تھی اور اس کے برابر میں وہ منبر تھا جہاں بیٹھ کر میرے دادا مفتی غلام مصطفےٰ قاسمیؒ خطبہ دیا کرتے تھے۔

گیانی جی نے میرے چہرے پر دکھ کی عبارت پڑھ لی "جب قومیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں تو وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہم تم نہیں چاہتے۔ ادھر گوردوارے رہ گئے ادھر مسجدیں رہ گئی ہیں۔ لیکن ہم نے اس مقدس جگہ کو مقدس ہی رہنے دیا ہے ہم بھی یہاں ایک رب کے نام کی مالا ہی جپتے ہیں!"

میں بوجھل قدموں سے ایک بار پھر مسجد کے صحن میں تھا۔ میں اپنے دادا کی قبر سے آنکھیں چرا رہا تھا جو دائیں جانب ایک کونے میں اپنی مکمل صورت میں موجود تھی۔

"آئیں فاتحہ پڑھتے ہیں" خواجہ مجید نے دلاسہ دینے کے انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا!

قبر پر کسی نے تازہ تازہ دیئے جلائے تھے' کچھ سوکھے ہوئے پھول بھی پڑے تھے۔

"یہ دیئے اور پھول یہاں کون رکھ گیا ہے؟" میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا۔ میں اپنے ان محسنوں کا نام جاننا چاہتا تھا جنھوں نے خوشبو اور روشنی والی اس قبر کو خوشبو اور روشنی ہی کا خراج پیش کیا تھا!

"یہ ایک بہت بڑے بزرگ کی قبر ہے" گیانی جی مسجد کے اندرونی حصے سے نکل کر ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے تھے" یہاں دور دور سے لوگ آکر منتیں مانتے ہیں اور دل کی مرادیں پاتے ہیں یہ دیئے اور پھول انہی عقیدت مندوں کی محبت کی نشانیاں ہیں"

"مگر امرتسر میں تو شاید اب کوئی مسلمان نہیں رہتا؟" میں نے پوچھا

تقریباً یہی صورت حال ہے البتہ کشمیر سے محنت مزدوری کرنے والے مسلمان ہاتو کئی صدیوں سے گرمیوں کے موسم میں یہاں آتے ہیں اس بزرگ کے عقیدت مندوں میں پرانے ہندو اور سکھ بھی شامل ہیں انہوں نے ان کی پاکیزہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا ہے"

یہ کہہ کر گیانی جی نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر میرے چہرے پہ پھیلی ہوئی اداسی دیکھ کر کہا" ان بزرگوں سے آپ کا کوئی رشتہ ہے؟"

"یہ میرے دادا ہیں" اور اس کے ساتھ ہی میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے فاتحہ کے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس دوران دو تین ہاتو بھی اندر آ گئے تھے' وہ بھی ہمارے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے۔ میں نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے ہوئے تھے مگر میں خدا سے کچھ نہیں مانگ رہا تھا۔ میں اس وقت ایک معصوم سا بچہ تھا جو اپنے دادا کی گود میں کھیل رہا تھا۔ دادا جانؒ پوتے کی حسرت دل ہی میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان صرف ایک رشتہ تھا' دادے اور پوتے کا! میں اپنے گالوں پر ان کی مہربان انگلیوں کا لمس محسوس کر رہا تھا اور میری پیشانی پر ان کے شیریں بوسے کا ذائقہ تھا۔ میں یہ ذائقہ اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتا تھا اور اسے اپنے بچوں تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر قبر کو بوسہ دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اپنے دادا کی منور پیشانی کو چوما ہے اور پھر مسجد سے باہر نکل آیا!

تھوڑی دیر بعد خواجہ مجید کی رہنمائی میں میں' اپنے آبائی گھر کے سامنے کھڑا تھا' یہ وہ گھر تھا جہاں میری پیدائش ہوئی تھی' جہاں ابا جی نے مجھے گڑھتی دی تھی اور میرے کان میں اذان دی تھی۔ یہاں اب ایک سردار جی رہتے تھے۔ انہوں نے بے حد گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ یہ تین منزلہ گھر تھا' جو در حقیقت صرف تین بڑے کمروں پر مشتمل تھا' اوپر نیچے بنے ہوئے ان تین کمروں کے صحن میں لوہے کے مگ تھے جن میں سے روشنی اور بارش چھم چھم کرتی اترتی تھی۔ ہمارے گھر والے اس گھر کے قصیدے پڑھا کرتے تھے؟ اس گھر کی کشادگی اور وسعت کی داستانیں بیان کیا کرتے تھے؟ اب ہم آٹھ بہن بھائی علیحدہ علیحدہ کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور ان کی تنگ دامانی کے شاکی ہیں تو کیا ہمارے دل اطمینان سے خالی ہو چکے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا کی یاد سے خالی دلوں میں بے اطمینانی کے دیو قبضہ کر لیتے ہیں؟ اس گھر کے مکینوں کے دل نور سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ کشادہ دل تھے اور انہیں اپنے گھر بھی کشادہ لگتے تھے۔ یہ وہ گھر تھا جہاں اقبالؒ کے ممدوح انور شاہ کشمیریؒ میرے دادا جان مفتی غلام مصطفےٰ قاسمیؒ کی وفات پر میرے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمیؒ کو پرسا دینے بطور خاص دیوبند سے چل کر آئے تھے اور انہوں نے میرے والد کی دستار بندی کی تھی۔ یہ گھر واقعی روشن اور

کشادہ تھا' ہم تنگناؤں اور اندھیروں کے مکین اس روشنی اور کشادگی کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں؟

ایک قلم کا سوال ہے بابا

جنس صاحب سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے' جس رکشے پر ہم آئے تھے' وہ ہم نے چھوڑا نہیں تھا چنانچہ اسے واپس اسٹیشن جانے کے لئے کہا اور تھوڑی دیر بعد ہم امرتسر ریلوے اسٹیشن کی عظیم عمارت کے باہر رکشے سے اتر رہے تھے ——— لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہم زائرین کی دونوں بسیں روانگی کے لئے بالکل تیار کھڑی تھیں' تمام زائرین اس میں سوار ہو چکے تھے اور غالباً" ان سب کو صرف ہماری آمد کا انتظار تھا۔ میں اور خواجہ مجید اپنی بس میں سوار ہونے لگے تو سی آئی ڈی کے ایک منحنی سے اہلکار نے ہمیں بس میں سوار ہونے سے روک دیا اور کہا" آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟" رکشے والا واپس مڑنے ہی کو تھا کہ میں نے" غفیہ والے" سے کہا کہ اسے روک کر پوچھ لو کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں۔ سی آئی ڈی کے اہلکار نے اس سے معلومات حاصل کیں اور پھر اس کے رکشے کا نمبر نوٹ کر کے اسے جانے دیا۔ اب وہ پھر میری طرف متوجہ تھا۔

"جی مہاراج! کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟"

"اپنے دادا کی قبر پر دعا مانگ کر آ رہا ہوں"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"عطاء الحق قاسمی؟"

"پتا جی کا کیا نام ہے؟"

"بہاء الحق قاسمی"

"کیا کرتے ہیں؟"

"کالج میں پروفیسر ہوں"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"میں نے بتایا ہے نا عطاء الحق قاسمی"

"کیا کرتے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کالج میں پروفیسر ہوں"

"کہاں گئے تھے؟"

وہ اپنی طرف سے مجھ پر جرح کر رہا تھا اور وہی تکنیک استعمال کر رہا تھا جو چوروں پر جرح کرتے ہوئے استعمال کی جاتی ہے' اس کا خیال تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور ایک ہی سوال بار بار اور اچانک پوچھنے سے میری زبان پر غیر ارادی طور پر سچ آجائے گا ——— جب اس نے مجھے بہت زیادہ زچ کیا تو میرے اندر کا "امرتسری لاہوری" بیدار ہو گیا اور میں نے اسے خوب سنائیں یہ سوچے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس دوران زائرین نے بھی شور مچانا شروع کر دیا تھا' جسٹس صاحب بھی اپنا عصا ہاتھ میں تھامے ہماری مدد کو پہنچ چکے تھے چنانچہ سی آئی ڈی کے اہلکار نے ہمیں بس میں سوار ہونے کی اجازت دے دی اور پھر دونوں بسیں آگے پیچھے واہگے کے لئے روانہ ہو گئیں۔

بارڈر پر پہنچ کر بسوں نے بریک لگائی دوسرے زائرین کے ساتھ میں بھی بس سے نکلا تو سامنے پھر وہی منحنی سا۔ سی آئی ڈی کا اہلکار میرا منتظر تھا۔

"جی مہاراج کہاں گئے تھے آپ؟"

"اپنے دادا کی قبر پر"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"عطاء الحق قاسمی"

"پتا جی کا کیا نام ہے؟"

"بہاء الحق قاسمی"

اس دوران اس کی نظر میری قمیص کی جیب میں اڑسے ہوئے ایگل کے قلم پر پڑی جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ تین چار روپے تھی۔ اس نے سوالات کا سلسلہ درمیان میں ہی

چھوڑا اور کہا۔

"مہاراج! یہ قلم بہت خوبصورت ہے!"

میں نے فوراً یہ "خوبصورت" قلم جیب میں سے نکالا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے "لالہ جی یہ آپ کی نذر ہے"

لالہ جی نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر قلم پر اس طرح جھپٹے جیسے شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے۔ اس کے بعد موصوف نے مجھ سے تمام تر گستاخیوں کی معافی مانگی اور مصافحے کے بعد معانقہ کر کے رخصت ہو گئے!

تو مے فروختنہ وچہ ارزاں فروختنہ

اس وقت شام ہونے کو تھی اور سرحد کی دوسری طرف پاکستانی پرچم پوری آن بان سے لہرا رہا تھا ——— میں یہاں سے اپنی زمین اور اپنے لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ بس درمیان میں چند سو گز کا فاصلہ تھا۔ رسمی کارروائیوں سے فراغت پا کر ہم لوگ پاک سرزمین کی طرف اس طرح لپکے جیسے صدیوں کی جدائی کے بعد وصال کے لمحے میسر آئے ہوں ——— اور اب ہمارے قدم پاک سرزمین پر تھے' پاک وطن جس کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ میں نے زمین پر سے ایک چٹکی مٹی اٹھائی اور اسے خوشبو کی طرح اپنے جسم پر چھڑک لیا "ال ہو" کی ضرب لگانے والے پیر صاحب کے مرید ان کے استقبال کے لئے یہاں موجود تھے انہوں نے لپک کر ان کا سامان اٹھایا اور پیر صاحب شان سکندری سے چلتے ہوئے اپنی کار کی طرف روانہ ہو گئے۔ نواز ہاشمی' خواجہ مجید' بھٹی صاحب اور غاشو پہلوان کے منہ مسلسل ہل رہے تھے' وہ یقیناً کچھ کھا رہے تھے۔ میں نے ان دوستوں سے معانقہ کیا اور ایک سرشاری کے عالم میں اپنی زمین پر چلنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے راستے میں کہکشاں بچھی ہے اور میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج ہے!

Optimized by www.ImageOptimizer.net

1985ء

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے!

پیٹھے کی تلاش میں

میں لاہور ائیرپورٹ کے انٹرنیشنل ڈیپارچر میں کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر اب پیرو مرشد سید ضمیر جعفری کے انتظار میں تھا دہلی جانے والی فلائٹ کے بارے میں اگرچہ ابھی تک کوئی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی تھی مگر اس کی روانگی کا وقت قریب سے "عنقریب" ہوتا جارہا تھا اور ضمیر صاحب کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا اس دوران میں دو تین دفعہ باہر سے بھی جھانک آیا تھا مگر اس "تانک جھانک" کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ چوتھی دفعہ جھانکنے پر گیٹ پر کھڑے "دربان" نے مجھے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ حضرت ذوق کا شعر یاد آگیا۔

جھانکتے ، تھے ہم انہیں جس روزن دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

لیکن بالآخر افلاک سے نالوں کا جواب آیا میں نے دیکھا کہ 68 سالہ سید ضمیر جعفری اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ جھومتے جھامتے کچھ اس تیزی سے لاؤنج میں داخل ہو رہے ہیں جیسے پابندئ وقت کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلے ہوئے ہوں میں نے انہیں راستے ہی میں جالیا اور پوچھا "حضرت! اتنی دیر کیسے ہوئی؟ بولے ڈیئر میں تو بہت دیر سے باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں! میں نے پوچھا کتنی دیر سے؟ یہی کوئی گذشتہ پانچ منٹ سے! میں نے ہنستے ہوئے ان کی ٹرالی کسٹم والی لائن کی طرف کھینچتے ہوئے کہا ان گذشتہ پانچ منٹوں سے پہلے آپ کہاں تھے؟ بولے گھر سے تو صحیح وقت پر نکلا تھا مگر راستے میں "پیٹھا" ڈھونڈتے ہوئے دیر ہو گئی مٹھائی کی دوکانیں تو راستے میں کئی نظر آئیں مگر اچھا پیٹھا بڑی مشکل سے ایک دوکان سے ملا لو تم بھی کھاؤ یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیٹھے کے دو ٹکڑے

مجھے تھما دیئے!

کسٹم پر کھڑے خوش پوش، خوش رو اور خوش ذوق نوجوان فرحت عباس نے جس طرح مجھے پہچان لیا تھا اسی طرح وہ ضمیر صاحب کو دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھا ان کے چار پانچ خوبصورت شعر خود انہی کو سنائے اور معمول کی کارروائی کے بعد چار پانچ منٹ میں انہیں فارغ کر دیا یہی "سلوک" امیگریشن والوں نے کیا اور پھر ہم پی آئی اے والوں سے انڈین ائیر لائنز کا بورڈنگ کارڈ لے کر سیکورٹی کے عملے کو تلاشی دینے کے لئے لائن میں کھڑے ہو گئے سیکورٹی والوں نے خود کار مشین کے ساتھ جسم ٹٹولنا شروع کیا تو میرے پورے جسم میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگیں سیکورٹی والوں نے تو خیر چونکنا ہی تھا خود میں بھی کچھ حیران سا ہو گیا کہ

خود مجھ کو اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

جب کہ سید ضمیر جعفری کی باری آنے پر خود کار مشین نے چوں تک نہ کی آواز صرف خالی برتن پیدا کرتے ہیں بھرے ہوئے برتن آواز نہیں کیا کرتے!

اب کیا کیا جائے فلائٹ تو خاصی لیٹ ہے میں نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے مسافروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

کرنا کیا ہے؟ پیٹھا کھایا جائے یہ کہہ کر ضمیر صاحب نے جیب سے پیٹھے کے دو اور ٹکڑے نکالے اور ان میں سے ایک میری طرف بڑھا دیا۔

حیدر آباد کے لئے دعا پیار

میں اور سید ضمیر جعفری حیدر آباد دکن میں زندہ دلان حیدر آباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے بھارت جارہے تھے اس کانفرنس میں پاکستان کی شرکت کے حوالے سے ہماری حکومت نے بھی خاصی دلچسپی لی تھی اور یوں ہماری حیثیت پاکستانی مندوبین کی تھی ادھر اگرچہ یہ کانفرنس "زندہ دلان حیدر آباد" کے زیر اہتمام منعقد ہو رہی تھی مگر ہم مہمان حکومت ہند کے تھے آئی سی آر (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز) نے ہماری آمد و رفت اور بھارت میں قیام کے اخراجات نیز خود ہمیں بھی برداشت

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کرنا تھا اس سے قبل صرف فیض صاحب آئی سی آر کے مہمان رہ چکے تھے اور یوں میزبانی کا یہ دائرہ پہلی بار وسیع ہوا تھا آج چھ فروری 85ء تھی رات ہم نے دہلی میں قیام کرنا تھا اور اگلے روز یعنی سات تاریخ کو حیدر آباد کے لئے روانہ ہونا تھا جہاں آٹھ سے بارہ فروری تک کانفرنس منعقد ہو رہی تھی حیدر آباد دکن! ایک زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نقطہ عروج! لیکن ہمیں آج کا حیدر آباد دیکھنا تھا! حبیب اللہ اوج نے بھی کہا تھا حیدر آباد کو میرا سلام کہنا اور میرا بہت پیار بھی دینا مجھے حیدر آباد کو یہ پیغام پہنچانے کی بہت جلدی تھی۔

پونے پانچ بجے انڈین ایئر لائنز کا جہاز دہلی کے لئے پرواز کر رہا تھا پائلٹ ایک سردار جی تھے "ہم دہلی تک کی دوری چالیس منٹ میں پوری کریں گے ہمیں امید ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا دہنے آباد! ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمنٹ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد پلاسٹک کی ایک تھیلی میں کاجو اور ایک کیک کا ٹکڑا ماتھے پر بندیا لگائے ساڑھی میں ملبوس ایک ایئر ہوسٹس نے مسافروں کو تھمانا شروع کر دیا میں نے "موازنہ انیس و دبیر" کی غرض سے انہیں غور سے دیکھا کہ پی آئی اے اور انڈین ایئر لائنز کی ایئر ہوسٹوں میں عقیدے کے علاوہ کیا فرق ہے معلوم ہوا کہ انڈین ایئر لائنز والوں نے بھی ایئر ہوسٹوں کے انتخاب میں اخلاقی پہلو کو اولیت دی ہے تاکہ مسافروں کے دل میں وسوسے پیدا نہ ہوں اور یوں ان کا ایمان خطرے میں نہ پڑے تاہم اس کے بعد دہلی سے حیدر آباد' حیدر آباد سے بمبئی' بمبئی سے پھر دہلی اور دہلی سے واپس لاہور پرواز کرتے ہوئے مجھے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنا پڑی امید ہے پی آئی اے والے بھی اپنے انتخاب پر نظر ثانی کریں گے۔

لاہور سے پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم بھارت کی فضائی حدود میں تھے خدا جانے اپنے ملک کی حدود سے نکلتے ہی میں خود کو غیر محفوظ سا کیوں محسوس کرنے لگتا ہوں بس یوں لگتا ہے جیسے ایک مشفق ہاتھ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے میں نے گھبرا کر "ٹائمز آف انڈیا" اٹھا لیا اور اس کے مطالعے میں محو ہو گیا! اس کے اندرونی صفحات پر ایک چار کالمی سرخی تھی "ہیومر اولمپک" اور یہ سرخی اسی عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے حوالے سے تھی جس میں شرکت کے

لئے میں اور ضمیر جعفری حیدر آباد جا رہے تھے مجھے اس سرخی نے بہت مزا دیا اور جب خبر کا متن پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس کانفرنس میں پاکستان سمیت چودہ ملکوں کے مزاح نگار شریک ہو رہے ہیں خبر میں باقی مندوبین کے نام نہیں تھے البتہ پاکستان کے حوالے سے ضمیر صاحب کے ساتھ میرا نام بھی تو سیفی جملوں سمیت درج تھا۔

صحبت صالح ترا صالح کند

معرکہ سگریٹ نوشی

مجھے اس دوران سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ ہم نان سموکنگ ایریا میں ہیں حالانکہ میں نے بورڈنگ کارڈ لیتے وقت تاکید کی تھی کہ مجھے سگریٹ نوشوں کی صحبت میں جگہ دی جائے تاہم میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پھر قریب سے گزرتے ہوئے سٹورٹ سے احتیاطاً پوچھا یہاں سگریٹ پینے کی ممانعت تو نہیں ہے پوچھا اس لئے کہ بقول ایک خان صاحب کے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟

"نہیں نہیں آپ شوق سے پئیں!" سٹورٹ نے خوش دلی سے کہا۔

بس پھر اللہ دے اور بندہ لے میں نے وہ دھواں دھار سگریٹ نوشی کی کہ اس سے پہلے کھڑکی سے باہر تو بادل تھے ہی اندر بھی بادل ہی بادل چھا گئے تھوڑی دیر بعد برابر والی رو سے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر آیا "ایکسکیوزمی" میں نے دیکھا ایک گورے چٹے ننھی منی ڈاڑھی والے مولوی صاحب مغربی سوٹ میں ملبوس مجھ سے مخاطب ہیں میں سمجھا اپنے مولانا کوثر نیازی ہیں مگر جب انہوں نے بزبان انگلیسی مجھ سے مذاکرات کا آغاز کیا تو پتہ چلا کہ یہ تو کوئی ناکارہ خلائق امریکی ہے۔

"آپ مہربانی فرما کر سگریٹ بجھا دیں ان نشستوں پر سگریٹ نوشی ممنوع ہے" امریکی نے قانون کا حوالہ اس طرح دیا جیسے امریکہ نے ہیروشیما پر بم کوئی قانونی تقاضا پورا کرنے کے لئے پھینکا تھا۔

"میں تعمیل ارشاد ضرور کرتا مگر جہاں بیٹھ کر میں سگریٹ نوشی کر رہا ہوں وہاں اس کی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اجازت ہے" میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے عرض کی۔

"یہ درست نہیں ہے اس لائن میں سگریٹ نوشی کی ممانعت ہے" امریکی نے کہا۔

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں مگر آپ احتیاطاً" سٹورٹ سے پوچھ لیں ہو سکتا ہے اس ضمن میں میری معلومات ہی درست ہوں!"

تھوڑی دیر بعد امریکی نے قریب سے گزرتے ہوئے سٹورٹ کو روک لیا "کیا اس لائن میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے؟"

"یس سر!"

"پھر یہ صاحب! سگریٹ کیوں پی رہے ہیں" امریکی نے پوچھا۔

"ان کی سیٹ دیوار کے سامنے ہے اور یہ دی آئی پی سیٹس ہیں وی آئی پی سگریٹ نوشی کر سکتے ہیں!"

یہ سن کر میں نے کمینی سی نظروں سے اس بونے سے امریکی کو دیکھا ابھی پونا سگریٹ باقی تھا مگر میں نے ایش ٹرے میں بجھا دیا فتح یابی کی صورت میں اپنی عظمت کا ثبوت عموماً اسی طرح پیش کیا جاتا ہے۔

دہلی ائیرپورٹ پر

اب دہلی قریب آ رہا تھا اور جہاز آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا ضمیر صاحب اس دوران اونگھ رہے تھے میں نے انہیں ٹہوکا دیا ضمیر صاحب اُٹھیے دہلی آگیا ہے ضمیر صاحب نے آنکھیں کھولیں اور کہا کم بخت! اپنی زبان درست کر' دہلی نہیں آیا ہم دہلی پہنچ گئے ہیں اور ساتھ ہی ہنسنا شروع کر دیا کہ یہ جملہ شفیق الرحمٰن کا تھا جن کا ایک کردار اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے ارے کم بختو! لکھنؤ نہیں آیا' ہم لکھنؤ پہنچ گئے ہیں۔ اس پر مجھے ابن انشاء یاد آگئے جنہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجاب والے جتنا خیال اپنی صحت کا رکھتے ہیں کاش! اتنا خیال زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور یو۔ پی والے جتنا خیال زبان کی صحت کا رکھتے ہیں کاش! اتنا خیال اپنی صحت کا بھی رکھیں۔

اب جہاز لینڈ کرنے والا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد سکھ پائلٹ نے آرام سے لینڈ کرنے کی بجائے دھم سے جہاز زمین پر گرا دیا غالباً" یہ سوچ کر کہ اور کچھ نہیں تو جہاز کو ہی نقصان پہنچاؤ میں نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دہلی کے پالم ائیرپورٹ پر قدم رکھا تو گھڑی پر پونے چھ بجے تھے میں نے گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا ضمیر صاحب دہلی سے لاہور کتنا قریب ہے؟

ہاں! ضمیر صاحب نے کہا اور کتنا دور بھی ہے۔

اچھا اچھا جمیر زافری صاحب!

دہلی کے پالم ائیرپورٹ پر اب جو مسئلہ درپیش تھا۔ وہ امیگریشن اور کسٹم والوں سے جان بخشی کروانے کا تھا کیونکہ یہاں تو کوئی چہرہ شناس حتیٰ کہ مردم شناس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سو میں نے ضمیر صاحب سے کہا "ضمیر صاحب' ہمارے لئے "علاقہ غیر" شروع ہو گیا ہے۔ اب کیا کیا جائے" ضمیر صاحب نے کہا "کرنا کیا ہے' شرافت سے قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کیا جائے" سو ہم دو طویل قطاروں میں سے ایک طویل قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دراصل ایک قطار دولت مشترکہ کے ممبر ملکوں کے باشندوں کے لئے تھی اور دوسری قطار ان مسافروں کی جو دولت مشترکہ کے رکن ملکوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر عالم یہ تھا کہ یہ دونوں قطاریں اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتی تھیں اور یوں دولت مشترکہ سے وابستہ یا ناوابستہ مسافروں سے یکساں سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔ میں نے ضمیر صاحب سے کہا "دولت مشترکہ سے پاکستان کی علیحدگی کا فیصلہ مجھے آج پہلی بار دانشمندانہ محسوس ہوا ہے کیونکہ ہر دو صورتوں میں اگر قطار ہی میں لگنا تھا "تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟" اسی دوران ضمیر صاحب قطار میں سے نکل کر ایک خالی بنچ پر جا کر بیٹھ گئے' تھوڑی دیر بعد وہ ٹائلٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے' اس کے بعد انہوں نے ڈیوٹی فری شاپ میں جھانکنا شروع کر دیا اور اب وہ ایک لالہ جی سے باتوں میں مشغول تھے یعنی ؎

Optimized by www.ImageOptimizer.net

تیرے کوچے اس بہانے میرا دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا' کبھی اس سے بات کرنا

اور پھر یوں ہوا کہ پاکستانی شلوار کرتے میں ملبوس' جیکٹ پہنے عینک لگائے گندمی رنگ کا ایک باوقار سا نوجوان ہماری طرف آیا اور ہمیں مخاطب کر کے کہا "ضمیر صاحب؟ قاسمی صاحب؟" اور پھر اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مجھے اشفاق گوندل کہتے ہیں میں یہاں پاکستانی سفارت خانے میں پریس اتاشی ہوں" گویا یہ "اپنے وطن دی بوٹی" تھی۔ ان کے ساتھ ہمارے ویزا سیکشن کے مبین صاحب بھی تھے۔ شاعر نے کہا تھا۔

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اور یہ شعر ہماری قوم کے گوڈوں گٹوں میں بیٹھ گیا ہے کیونکہ ہم رہنمائی کے لئے بھی کسی مسیحا یا کسی خضر کی بجائے کسی ہمدم دیرینہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اشفاق گوندل ہمارے ہمدم دیرینہ نہیں تھے کیونکہ آج پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہو رہی تھی' چنانچہ وہ ہمارے لئے مسیحا اور خضر ثابت ہوئے' ہمیں لائن میں سے نکالا' منٹوں سکنڈوں میں امیگریشن کے مراحل سے فارغ کیا' چشم زدن میں کسٹم کے پل صراط پر سے گزارا اور پھر ہم ان کے رفیق کار مبین صاحب کے ساتھ باہر آ گئے!

اور باہر ایک نوجوان تیر کی طرح میرے پاس آیا "قاسمی صاحب؟" مجھے وہ شکل صورت سے نجومی نہیں لگتا تھا۔ مگر اس کے ستاروں کا حساب بالکل درست تھا۔ "جناب نے بالکل درست فرمایا' بندہ قاسمی صاحب ہی ہے اور یہ ضمیر جعفری صاحب ہیں"

"اچھا اچھا' جمیر زافری صاحب" اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمستے کیا "میرا نام گپتا ہے۔ میں آپ کے سواگت کے لئے آئی سی سی آر (انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز) کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ حکومت ہند کے مہمان ہیں۔ مسز ترپاٹھی نے آپ کو آداب کہا ہے" یہ مسز ترپاٹھی آئی سی سی آر کی ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھیں۔ بعد میں ان کے دفتر

میں ان سے ملاقات ہوئی تو جی میں آئی کہ ان کے حسن کار کردگی میں ان کے حسن اور حسن اخلاق کے نمبر بھی شامل ہونے چاہئیں' مگر ایسے معاملات میں وطن میں ہماری کون سنتا ہے کہ پردیس میں سنے گا؟

کنشکا ہوٹل۔ اندرون چنگیز سے تاریک تر

"آپ کے لئے "کنشکا" ہوٹل میں کمرے ریزرو ہیں۔ اور ایک گاڑی بھی آپ کی ڈسپوزل پر ہے۔ آپ سیدھا ہوٹل جانا پسند کریں گے یا اس سے پہلے کوئی اور پروگرام بھی ہے؟" گپتا جی نے پوچھا۔

اس وقت میری گھڑی میں شام کے سات بجے تھے۔ انڈیا ہم سے آدھ گھنٹہ آگے ہے' چنانچہ میں نے اپنی گھڑی کی سوئیاں ساڑھے سات پر کیں اور گپتا جی سے کہا "ہم سیدھے ہوٹل چلیں گے" اشفاق گوندل نے کہا "اور پھر وہاں سے سیدھے میرے گھر' کیونکہ آپ لوگوں نے رات کا "نکر" میری طرف کھانا ہے۔ میں نے اپنے اور آپ کے بعض دوستوں کو بھی مدعو کیا ہوا ہے!"

اور پھر مسٹر گپتا کے ساتھ بھارت کی بنی ہوئی ایمبیسڈر کار میں بیٹھ کر ہم ہوٹل کنشکا کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے رستے میں ضمیر صاحب کے کان میں کہا "ہم بھارت سے آدھ گھنٹہ پیچھے ہیں اور اس آدھ گھنٹے میں بھارت نے اپنی صنعت اور جمہوریت کی بنیادیں مستحکم کی ہیں" ظاہر ہے قوموں کی زندگی میں پینتیس چھتیس سال ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے!

دہلی کی کشادہ سڑکوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے چوراہوں سے گزرتے ہوئے راستے میں کئی باراتیں روایتی انداز کی نظر آئیں۔ ایک بارات کا دولہا سر پر لنگی باندھے فٹن میں بیٹھا ہوا تھا' آگے آگے بینڈ باجے والے تھے اور پیچھے بیسیوں باراتی ہاتھوں میں ہنڈولے اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ذرا آگے چل کر ایک فٹ پاتھ کے کنارے پر کچھ باراتی جن میں خواتین بھی تھیں' کچھ پریشان سے کھڑے تھے۔ ان کے برابر میں چاندی کے زیورات سے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

لدھا ہوا گھوڑا کھڑا تھا' جس پر دولہا موجود نہیں تھا' غالباً" یہ مرد دانا موقع پاکر فرار ہو گیا تھا۔ کار نئی دہلی کی سڑکوں پر فراٹے بھرتی جارہی تھی اور تھوڑی دیر بعد ہم فائیو سٹار کنشکا ہوٹل کی عظیم الشان لابی میں کھڑے کاؤنٹر کلرک سے اپنے کمرے کی چابیاں وصول کر رہے تھے۔ گپتا جی ہمیں نمستے کہہ کر رخصت ہو گئے تھے' اب انہوں نے ہمیں کل ائیرپورٹ پر چھوڑنے کے لئے آنا تھا' جہاں سے ہم نے حیدر آباد دکن میں عالمی مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہونا تھا۔

617 اور 618 نمبر کمرے میں پہنچنے کے لئے جونہی ہم لفٹ میں داخل ہوئے' لفٹ کچھ اس پھرتی سے بند ہوئی جیسے اوپر پہنچنے کی ہم سے زیادہ اسے جلدی تھی۔ اسی طرح چھٹے فلور پر پہنچ کر لفٹ میں سے نکلتے ہوئے ہم اس کی پھرتیوں کی وجہ سے ایک بار پھر اس میں پھنستے پھنستے رہ گئے۔ اور اس کے بعد دو چار ایسے تجربات سے گزرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ "لفٹ" خواہ لفٹ سے مانگی جائے' یا امریکہ سے' اپنی گردن بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

سرکاری سرپرستی میں چلنے والے ہوٹل کی لفٹ کی کرشمہ سازیاں تو ہم دیکھ چکے تھے' اس کی بدحالی کی دوسری صورتیں کمرے میں پہنچ کر بھی نظر آئیں۔ پس ثابت ہوا کہ سرکاری تحویل میں جو چیز چلی جائے اس میں خیر کا پہلو ذرا کم کم ہی نظر آتا ہے چنانچہ ضمیر صاحب نے ہوٹل کی خوبصورت لابی دیکھی تھی اور اب پریشانی کے عالم میں اس ہوٹل کا باطن دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ان سے نہ رہا گیا کہنے لگے "اقبال نے ایک مصرع اس ہوٹل کے بارے میں بھی کہا ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کونسا؟" بولے یہی کہ ؎

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

میں نے ہنستے ہوئے منیر نیازی کے انداز میں کہا "بالکل ٹھیک' لیکن اب میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں' آپ بھی ذرا منہ ہاتھ دھولیں' ابھی اشفاق صاحب کے ہاں جانا ہے" اور ابھی میں یہ جملہ ادا کر ہی رہا تھا کہ متین صاحب آدھمکے "چلئے جناب! اشفاق گوندل صاحب کے ہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے!"

دوستوں کے درمیان

سروجنی نگر میں واقع اشفاق گوندل کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' ان کی بیگم منورما اور ڈاکٹر خلیق انجم کے علاوہ پاکستان ایمبسی کے منسٹر انفارمیشن حسن عسکری بھی موجود تھے۔ حسن عسکری' کسی زمانے میں اردو کے معروف افسانہ نگار تھے جو ابن سعید کے نام سے افسانے لکھا کرتے تھے اب انہیں کالعدم افسانہ نگار کہا جاسکتا ہے کہ فرائض منصبی میں غفلت کے اندیشے سے افسانہ نگاری چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہاں ساجد صاحب بھی تھے ہمارے کمرشل اتاشی' بے حد ہنس مکھ' ڈاکٹر خلیق انجم محقق ہونے کے باوجود اپنے بردار مکرم مشفق خواجہ کی طرح بے پناہ فقرے باز ہیں۔ چنانچہ وہ دائیں بائیں اپنے جملے لڑھکاتے رہے۔ انہیں فقرہ سوجھ جائے تو فقرہ ضائع نہیں کرتے' خواہ بندہ ضائع ہو جائے۔ مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے "دہلی میں داغ پر سیمینار ہو رہا ہے اگر آپ ایک دن اور رک جائیں تو اس کے ایک اجلاس کی صدارت فرما کر ہماری عزت افزائی کریں!" مگر ابھی ان کا فقرہ ادھورا تھا بولے "ہمارے یہاں بڑے بڑے عجیب لوگ صدارت کرتے ہیں' آپ تو ماشاء اللہ پھر بھی تھوڑے بہت معقول آدمی ہیں!" ڈاکٹر گوپی چند نے اس پر قہقہہ لگایا اور خلیق انجم سے کہا "انہوں نے تو کل چونکہ لازماً" جانا ہے' لہٰذا اس دفعہ بھی سابقہ روایات کے مطابق آپ خود صدارت کرلیں" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان دنوں اپنے مضامین کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ ابھی انہوں نے اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا' میں نے کہا "نارنگ صاحب' اس مجموعے کا نام "نارنگ خیال" رکھ لیں۔

جب ہم کھانا کھا کر نکلے تو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ صبح صبح میرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف ہوٹل کی افسر مہمان داری تھیں۔ ایک تو میں نیند میں تھا' دوسرے میں پردیسی تھا اور تیسرے وہ انگریزی بول رہی تھیں' مجھے جو سمجھ آیا وہ یہ تھا کہ کوئی خاتون ہے جو نیچے لابی میں موجود ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا" ٹھیک ہے' کمرے میں تشریف لے آئیں" بہت دیر انتظار کیا' مگر وہ آئی ہی نہیں ——— میں

Optimized by www.ImageOptimizer.net

نے ضمیر صاحب کے کمرے میں فون کیا اور کہا اس قوم پر انتقاء کا نزول ہونے والا ہے' کیونکہ یہ جو کہتے ہیں' وہ کرتے نہیں ہیں اور پھر میں نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ ضمیر صاحب یہ سن کر ہنسے اور کہنے لگے "اس نے مجھے بھی ابھی ابھی فون کیا تھا اور پوچھا تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے نیز یہ کہ رات کیسی بسر ہوئی ہے۔ میں نے کہا کوئی تکلیف نہیں' باقی رات ویسے ہی بسر ہوئی ہے' جیسی پردیسوں کی بسر ہوتی ہے!" تب میں نے جانا کہ اس دیوی نے غالباً مجھ سے بھی یہی کچھ کہا تھا' بس میرے اور ضمیر صاحب کے جواب میں فرق صرف یہ پیدا ہوا کہ میں دسویں جماعت کی طرح اس دفعہ بھی ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی غلطی کر بیٹھا۔

وی آئی پی' اشتہاری مارکہ

ناشتے کی میز پر ضمیر جعفری نے کہا "یار ہم تو خاصے امپورٹینٹ لوگ ہیں' ایک عالمی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں' جس میں دنیا کے دوسرے چودہ ملک بھی شریک ہیں' ائیرپورٹ پر حکومت ہند کا نمائندہ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا ہمارے سفارت خانے کے لوگ بھی ہمیں ریسیو کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جہاز میں بھی ہمیں وی آئی پی نشستوں پر بٹھایا گیا۔ ٹائمز آف انڈیا اور دوسرے موقر اخباروں نے ہماری آمد کی خبر کو اہمیت دی ہے' چنانچہ اپنی اہمیت کا اندازہ تو بس ان دو چار گھنٹوں ہی میں ہوا ہے!" میں نے عرض کیا" آپ نے بجا فرمایا' مزید اہمیت اور اپنے وی آئی پی ہونے کا اندازہ آپ کو ناشتے کے فوراً بعد ہو گا!" ضمیر صاحب نے پوچھا" وہ کیسے؟" میں نے کہا" وہ ایسے کہ یہاں سے اٹھ کر ہم سیدھے تھانے جائیں گے اور بستہ الف کے بدمعاشوں کی طرح اپنی حاضری لگوائیں گے' کیونکہ قانون کے مطابق چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہم نے تھانے میں اپنی حاضری لگوانی ہے" ضمیر صاحب کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو' ہم بھارتی حکومت کے مہمان ہیں' پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں' ادیب ہیں' دانشور ہیں' کیا ہمیں اس حاضری سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا' ہمارا سفارت خانہ تو بھارت سے پاکستان جانے والے دانشوروں کو بیشتر صورتوں میں اس قانون سے مستثنیٰ قرار دے ڈالتا ہے!" ——— "کرتا ہو گا" میں نے کہا"

لیکن آپ جلدی سے چائے ختم کریں' نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!"

اور اب ہم وی آئی پیز' انکم ٹیکس کے دفتر کے پاس واقع پولیس کمشنر آفس میں دہلی میں اپنی آمد لکھوانے کے لئے قطار میں کھڑے تھے۔ 1982ء میں جب میں اور اجمل نیازی انبالے کے مشاعرے میں شرکت کے بعد اسی دفتر میں اپنی ارائیول لکھوانے کے لئے پہنچے' تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے پولیس کے اہلکار نے ہمارے کاغذات دیکھ کر کہا تھا" آپ نے انبالے سے روانہ ہوتے ہوئے وہاں سے ڈیپارچر نہیں لکھوایا۔ لہٰذا ہم آپ کی ارائیول نہیں لکھ سکتے' کیونکہ جب آپ انبالے سے روانہ ہی نہیں ہوئے تو دہلی میں آپ کی آمد کیسے لکھی جا سکتی ہے" پھر اس پولیس والے نے ہمیں بتایا کہ آپ نے سنگین جرم کیا ہے' اس کی سزا پانچ سال قید ہے۔ لیکن تین وجوہ کی بناء پر آپ کو معاف کیا جاتا ہے' پہلی وجہ یہ کہ آپ مہمان ہیں' دوسری یہ کہ آج ہولی ہے اور تیسری وجہ یہ کہ آپ قوال ہیں!" تیسری وجہ سن کر اجمل نیازی اپنے لمبے لمبے بالوں کو نوچنے لگا مگر پولیس والے نے ازراہ لطف و کرم پورے اطمینان سے کہا" اب آپ فوراً واپس انبالے پہنچیں! وہاں تھانے سے ڈیپارچر لکھوائیں' اس کے بعد دہلی آئیں تاکہ ہم آپ کی ارائیول لکھ سکیں!" ہم نے بہت کہا کہ ہم انبالے سے ڈیپارچر لکھوا کر آئے ہیں' مگر اس کا کہنا تھا کہ ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں مگر کاغذوں پر یہ ڈیپارچر درج نہیں ہے' خدا کا شکر ہے اس دفع ہمیں کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی شریمتی جی نے جلد خلاصی کر دی۔

ہوٹل واپس پہنچے تو گپتا جی ہمارے انتظار میں تھے۔ ہم نے انہیں اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا' وہ جھجکتے جھجکتے کمرے میں آئے ہم نے کافی کا پوچھا' انہوں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔ وہ ہمیں حیدر آباد لے جانے کے لئے ائیرپورٹ تک چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ ہم نے کہا آپ کچھ دیر انتظار کیجئے' ہم ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ گپتا جی کچھ "ان ایزی" سے محسوس کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "میں نیچے لابی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں' آپ وہاں تشریف لے آئیں!" میں ان کا مسئلہ سمجھ گیا تھا'

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ایک پاکستانی کے کمرے میں ایک بھارتی شہری کی اتنی دیر موجودگی' خواہ وہ بیچارہ سرکاری فرائض ہی ادا کیوں نہ کر رہا ہو' اس کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی' چنانچہ میں نے کہا "ٹھیک ہے آپ تشریف لے چلیں' ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں" اللہ جانے شکوک و شبہات کی یہ فضا کب ختم ہو گئی؟

ائیرپورٹ پر گپتا جی نے ہمیں الوداع کہا اور پھر ہم مقامی مسافروں کی طرح بورڈنگ کارڈ لے کر سیکورٹی چیکنگ کے لئے مخصوص بوتھ میں داخل ہو گئے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بھارتی جہازوں کے پے در پے اغوا کے باوجود سیکورٹی کے انتظامات انتہائی ناقص تھے۔ سیکورٹی سٹاف نے ہماری تلاشی اس طرح لی کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اتنے پیسوں میں تو اتنی ہی تلاشی لی جا سکتی ہے۔

اور پھر ایک بج کر پچاس منٹ پر جہاز فضا میں تھا۔ اب ہماری منزل حیدر آباد دکن تھی' حیدر آباد دکن جہاں ہم پہلی بار جا رہے تھے مگر جہاں ہمارے بزرگ صدیوں پہلے گئے تھے اور پھر صدیوں تک وہاں رہے تھے!

یہ غالباً" ائیر بس تھی جس میں ہم سوار ہوئے تھے سو یہ جہاز کیا تھا کوئی دو کنال کا بنگلہ تھا جو ہلکی پھلکی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑتا چلا جا رہا تھا مگر اس "بنگلے" کے مکینوں کو پیاس بہت لگ رہی تھی چنانچہ جہاز کے سیدھا ہوتے ہی مسافروں نے حفاظتی پٹیاں ڈھیلی کرنے اور سگریٹ سلگانے کے بعد اپنی نشست پر لگی گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں اور "العطش العطش" پکارنے لگے جدھر سے گھنٹی کی آواز کے ساتھ نشست کے اوپر لگی سرخ بتی روشن ہوتی جہاز کا عملہ دوڑا دوڑا اس طرف آتا اور کچھ اس طرح پانی پیش کرتا کہ پینے والا پانی پانی ہو جاتا کچھ دیر بعد جہاز کے عملے پر مجھے فائر بریگیڈ کے عملے کا گمان ہوا باقی لوگوں کا تو ذکر کیا خود مجھے بہت پیاس لگ رہی تھی چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے گھنٹی بجانا پڑتی جس پر ایک سانولی سلونی ائیر ہوسٹس ماتھے پر لگی بندیا کے ساتھ جگ ہاتھ میں لئے چلی آتی مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی ایک دفعہ تو اس کے ماتھے پر بندیا کی جگہ تیوریاں نظر آئیں اس وقت مجھے اپنا ایک دوست

محمود بہت یاد آیا میں اور وہ ترکی جا رہے تھے فضا میں پرواز کے دوران ائیر ہوسٹس آئی اور اس نے شائستگی سے پوچھا آپ کیا پئیں گے؟ میں نے کہا "گریپ فروٹ جوس" پھر اس نے محمود سے پوچھا آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ محمود نے اپنی عینک اتاری اس کے شیشے صاف کئے اور پھر آغا حشر کے کسی رومانوی کردار کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عاشقانہ انداز میں کہا جو آپ پلا دیں! اس پر میں اپنے جوس سے بھی محروم ہو گیا کیونکہ وہ واپس ہی نہیں آئی آج سید ضمیر جعفری میرے ہم سفر تھے تھوڑی دیر بعد کھانا "سرو" ہونے والا تھا میں نے انہیں بھوکا رکھنا مناسب نہ سمجھا چنانچہ خود پیاسا رہنا منظور کر لیا۔

"یار آج کل لوگ حس مزاح سے محروم ہوتے جا رہے ہیں" سید ضمیر جعفری نے پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد کہا۔

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے!" میں نے خلال کرتے ہوئے جواب دیا "صورت حال تو اس قدر افسوس ناک ہے کہ اخباروں کے اداریئے پڑھ کر بھی لوگوں کے ہونٹوں پر ہنسی نہیں آتی۔"

"تم پھر بیچ میں سیاست گھسیٹ لائے" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "میں تمہیں اپنے ایک دوست کی زندہ دلی کا واقعہ سنانے لگا تھا ان دنوں اتنا حوصلہ بہت کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں آپ ارشاد فرمائیں!" حالانکہ اس وقت میرا جی پھر گھنٹی بجانے کو چاہ رہا تھا پیاس جو محسوس ہو رہی تھی۔

"ہمارا ایک دوست تھا" ضمیر صاحب نے کہا "شاعر بھی تھا زبردست ہومیو پیتھ بھی اور اس کے ساتھ نہایت بذلہ سنج تھا جب وہ بیمار ہوا اور بستر مرگ پر تھا تو میں نذیر احمد شیخ اور دوسرے دوست اس کی عیادت کو گئے وہ اپنی جگہ سے ہلنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا نحیف سی آواز میں کہنے لگا میری ایک آخری خواہش ہے۔

ہم نے آزردہ لہجے میں پوچھا وہ کیا؟

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کہنے لگا تم لوگ ابھی میرے سامنے بیٹھے بیٹھے میرا مرثیہ لکھو مگر شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی شعر سنجیدہ نہیں ہونا چاہئے!"

ہم نے کہا یہ "تم کیا کہہ رہے ہو ایسا نہیں ہو سکتا!"

بولا "گویا تم میری آخری خواہش پوری نہیں کرنا چاہتے؟" اور پھر اس نے اتنا اصرار کیا کہ ہمیں طوعاً" و کرہاً" اس کی فرمائش پوری کرنی پڑی ہر شعر پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل جاتی وہ کھل کر ہنسنا چاہتا مگر اس میں ہنسنے کی سکت نہیں تھی!

"پھر کیا ہوا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا میری اس ہنسی میں شدید حیرت بھی پنہاں تھی "پھر اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ ہوا!" ضمیر صاحب نے بتایا جب اس کی سانس اکھڑ رہی تھی تو ایک دیہاتی مریض اندر داخل ہوا کیونکہ یہی کمرہ اس کا کلینک بھی تھا اس نے بغیر صورت حال جانے اپنی تکلیف بیان کی ہمارے اس دوست نے اس کی تکلیف سنی پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اندر سے فلاں فلاں دوا لے آؤ بیوی وہ دوا لے آئی ہمارے اس دوست نے اکھڑے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا یہ پڑیاں رات کو سونے سے پہلے کھا لینا دیہاتی نے کہا اگر میں اس وقت نہ کھا سکوں تو؟ ہمارے دوست کے چہرے پر آخری مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا تو پھر جب سو جاؤ تو اس وقت کھا لینا! اور اس کے ساتھ ہی وہ آخری ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔"

یہ واقعہ سناتے ہوئے ضمیر صاحب کچھ اداس سے ہو گئے تھے خود میں نے بھی اپنی اداسی پر قابو پانے کے لئے کہا "اب ایک لطیفہ میں آپ کو سناتا ہوں!"

"سناؤ!" ضمیر صاحب نے کچھ اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں سناؤ اور جان چھوڑو! مگر پھر وہ اچانک چونک پڑے کہنے لگے تم لطیفہ بعد میں سنانا میں کہیں بھول نہ جاؤں پہلے تم ایک بات حیدر آباد پہنچتے ہی مجھے یاد کرا دینا!"

وہ کیا" میں نے پوچھا

"وہاں تھانے جا کر ارائیول لکھوانی ہے" گویا اب ارائیول اور ڈیپارچر میرے علاوہ ضمیر صاحب کے اعصاب پر بھی سوار ہو چکی تھی۔

آپ کے پاس تھوڑا سا پیتھا ہو گا؟

"ٹھیک ہے میں نے کہا مگر لطیفہ سنیں" ایک شخص چھ مہینے پاگل خانے میں گزارنے کے بعد جب میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو ڈاکٹروں نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ اب بالکل مکمل طور پر تندرست ہو چکا ہے چنانچہ ڈسچارج کرنے سے پہلے انہوں نے اس سے پوچھا کہ پاگل خانے سے رہائی کے بعد اس نے مستقبل کے لئے کیا پلاننگ کی ہے؟ اس پر متذکرہ شخص نے جواب دیا کہ وہ پاگل خانے سے نکلتے ہی سیدھا اپنے گھر جائے گا ایک غلیل بنائے گا اور پھر اس سے سارے محلے کے شیشے توڑ دے گا اس پر ڈاکٹروں کا ماتھا ٹھنکا چنانچہ انہوں نے اسے مزید چھ ماہ کے لئے ہسپتال میں ایڈمٹ کر لیا چھ مہینے بعد وہ مریض دوبارہ میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے نہایت دانائی کی باتیں کیں مگر آخر میں کہا کہ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد وہ ایک غلیل بنائے گا اور محلے کے سارے شیشے توڑ دے گا چنانچہ اسے ایک بار پھر ہسپتال میں روک لیا گیا تیسری بار ڈاکٹروں نے اس سے اپنی گفتگو کا آغاز ہی یہاں سے کیا کہ وہ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد کیا کرے گا اس پر متذکرہ شخص نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ وہ پاگل خانے کا فضول کھانا کھا کھا کر تنگ آ چکا ہے چنانچہ وہ یہاں سے نکلتے ہی کسی اچھے سے ریستوران میں جائے گا اور بہت اچھی خوراک کھائے گا اس کے بعد وہ اپنے لئے اچھے اچھے کپڑے سلائے گا پھر اپنی محبوبہ کو فون کرے گا اور اس کے ساتھ ڈرائیو پر جائے گا یہ سن کر ڈاکٹروں نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا پھر کیا کرو گے؟ کہنے لگا ڈرائیو سے واپسی پر میں اپنے کمرے میں واپس آؤں گا اپنے پاجامے میں سے الاسٹک نکالوں گا پھر اس کی بناؤں گا غلیل اور محلے کے سارے شیشے توڑ دوں گا!

ضمیر صاحب کی ہنسی سے جہاز ڈولنے لگا تبھی حفاظتی پیٹیاں دوبارہ باندھنے کی عبارت روشن ہو گئی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد ائیر ہوسٹس کی اناؤنسمنٹ سے اندازہ ہوا کہ ہم تقریباً دو گھنٹے کی فلائٹ کے بعد حیدر آباد دکن کے ائیر پورٹ پر اترنے والے ہیں چنانچہ اب طیارہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا حیدر آباد دکن

Optimized by www.ImageOptimizer.net

حیدر آباد سندھ کی طرح لگ رہا تھا۔

"اب جلدی سے بتاؤ آج حیدر آباد پہنچنے کے بعد کیا کرنا ہے؟" ضمیر صاحب نے کہا۔

کچھ بھی نہیں "میں نے کہا" ایئر پورٹ پر کانفرنس کے منتظمین ہمارے استقبال کے لئے آئے ہوں گے وہ ہمیں گاڑیوں میں بٹھائیں گے پھر ہمیں ہوٹل لے جائیں گے وہاں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے دوسرے مندوبین بھی مقیم ہوں گے"

"پھر کیا ہو گا؟" ضمیر صاحب نے پوچھا۔

"پھر ہم ان سے گپ شپ کریں گے!"

"پھر؟" "پھر ہم نہائیں گے صاف ستھرے کپڑے پہنیں گے عمدہ سا کھانا کھائیں گے۔"

"پینٹھا بھی کھائیں گے" ضمیر صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پینٹھا بھی کھائیں گے"

"پھر؟"

پھر اس کے بعد ہم معزز مہمان تھانے جائیں گے اور ارائیول رپورٹ لکھائیں گے۔"

"ہت تیرے کی" ضمیر صاحب کے منہ کا مزا خراب ہو گیا' چنانچہ انہوں نے جیب میں سے ٹیٹھے کی ایک قاش نکالی اور آدھی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو تم بھی کھاؤ"

اب جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ سیڑھیوں کے قریب وہی ائر ہوسٹس ہاتھ جوڑے کھڑی' مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی۔ محمود یہاں ہوتا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔

بسوں میں بیٹھ کر جب ہم لاؤنج کی طرف جانے لگے تو میں نے دیکھا میرے برابر میں ایک بارعب سی شخصیت شیروانی اور شلوار میں ملبوس کھڑی ہے۔ یہ اپنے حسن عسکری تھے۔ ہمارے سفارت خانے کے منسٹر انفارمیشن!

"آپ دہلی سے اس بس میں آئے ہیں" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی! آپ بھی اسی جہاز میں تھے؟ میں نے آپ لوگوں کو دیکھا ہی نہیں" انہوں نے مجھے اور ضمیر جعفری کو اچانک اپنے سامنے پا کر کہا۔ حسن عسکری حکومت پاکستان کی نمائندگی کے لئے اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کی لئے مدعو کئے گئے تھے۔ انہیں اس طرح اپنے پاس پا کر عجیب طرح کی فرحت محسوس ہوئی۔

جب لاؤنج کے قریب پہنچے تو دروازے کے قریب لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا جو ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے' زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا' ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے! مجھ پر کچھ رقت سی طاری ہو گئی! ہم اس قابل تو نہ تھے!

پھر ہم نے ایک لمبا تڑنگا صحت مند شخص دیکھا' جس نے کرتا پہنا ہوا تھا اور ہندوؤں کے مخصوص انداز میں دھوتی باندھی ہوئی تھی' وہ لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا اور لوگ اسے دیکھ کر پوری وارفتگی سے زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ یہ بھارت کی قومی اسمبلی کے سپیکر بلرام جاکھر تھے' جو عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے افتتاح کے لئے اسی جہاز سے ہمارے ساتھ حیدر آباد پہنچے تھے۔ اور لوگ انہی کے استقبال کو پہنچے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جو مجھ پر رقت طاری ہوئی تھی وہ اب زائل ہو چکی تھی میں نے ضمیر صاحب سے کہا "آپ کے پاس تھوڑا سا پینٹھا ہو گا؟"

روسی بٹ صاحب سے ملاقات

جہاز کی سیڑھیوں سے لاؤنج کا فاصلہ طے کیا تو اچانک مجھے کچھ تلاش کرتی آنکھیں نظر آئیں اور تھوڑی دیر بعد میرے سامنے میرے رفیق قلم کھڑے تھے جنہیں میں غائبانہ طور پر جانتا تھا اور جو مجھے جانتے تھے مگر اس سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا سو تعارف پر میں مسرت سے انہیں تک رہا تھا۔ اچھا تو یہ ہیں نریندر لوتھر سارے فساد کی جڑ یعنی "زندہ دلان حیدر آباد" کے صدر' یہ ہیں طالب خوند میری "زندہ دلان حیدر آباد" کے جنرل سیکرٹری اور یہ ہیں اپنے ورما جی! اب ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے' اتنی بڑی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کانفرنس کے انتظامات کے جھمیلے میں یہ مزاح نگار سٹی بھولے ہوئے تھے اور میں ان کی اس کیفیت سے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "پتر دھوا چوپو" میں نے دل ہی دل میں کہا اور جی چاہا کہ انہیں اس فقرے کا مطلب بھی سمجھاؤں مگر اس دوران وہ ایک اور شخص سے بغل گیر ہو رہے تھے' دراز قد' سرخ و سفید رنگ یہ صاحب مجھے کشمیری بٹ لگ رہے تھے!

"ان سے ملیں" نرنیدر لوتھر "بٹ صاحب" کا ہاتھ تھامے ہماری طرف آئے "یہ بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے آپ کے ساتھ اسی جہاز میں آئے ہیں۔ یہ روسی مزاح نگار آندرے این یاختوف ہیں!"

روس پاکستان کو چاقو سے گدگدیاں کر کے ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر اس مزاح نگار کے چہرے پر تو بچوں ایسی معصومیت ہے۔ ویسے عمر بھی کچھ زیادہ نہیں' چند برس پہلے تک اس کا آدھا ٹکٹ لگتا ہو گا!

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ہمیں واقعی ایک دوسرے سے مل کر دلی خوشی ہوئی تھی حالانکہ یہ الفاظ ہم نے ایک دوسرے سے کہے نہیں تھے صرف دل میں محسوس کئے تھے!

اس دوران ہمارا سامان جہاز سے اتر چکا تھا اور اب ہم فی تگ کے حساب سے سامان کا "جگا ٹیکس" ادا کر کے لاؤنج سے باہر کھڑے تھے۔ دریں اثناء ہمارے میزبانوں نے کانفرنس کے افتتاح کے لئے آئے ہوئے بھارت کی لوک سبھا کے سپیکر مسٹر بلرام جاکھر کو ان کی گاڑی میں بٹھا کر انہیں الوداع کہہ دیا تھا۔ اب انہوں نے مجھے' ضمیر جعفری' حسن عسکری' آندرے اور اڑیسی زبان کے ایک مزاح نگار کو "ڈسپیچ" کرنا تھا! باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں ان میں ہمارا سامان لادا گیا اور ڈرائیور کو ہدایت کی گئی کہ انہیں ہوٹل سیمپورنا چھوڑ آؤ۔ سیمپورنا ہندی کا لفظ ہے جس کا مطلب "مکمل" ہے اور یہ "مکمل عورت" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا

ہے۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں میرا سامان لادا گیا تھا۔ اس میں درماجی تھے اور اڑیسی زبان کے وہ مزاح نگار جن کا نام ذہن میں "اڑیاں" کر رہا ہے' مگر یاد نہیں آ رہا۔ دوسری گاڑی میں اپنے ضمیر صاحب تھے اور عسکری صاحب تھے۔

ضمیر صاحب نے آواز دی "تم نے حیدر آباد پہنچتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو" میں نے ان کی آواز پر کان دھرا اور اپنی گاڑی سے نکل کر ان کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا اور بعد میں یہ بات ایک دفعہ پھر ثابت ہوئی کہ جس کسی نے ضمیر کی آواز پر کان دھرا اس نے اس کا خمیازہ بہر حال بھگتا مگر یہ داستان بعد میں بیان ہو گی!

موازنہ "انیس و دبیر"

"میں نے گورنر ہریانہ مظفر برنی صاحب کے سیکرٹری کو آپ کی بھارت آمد کی اطلاع دے دی تھی' وہ ادب کے بہت اچھے قاری ہیں اور آپ کے بہت مداح ہیں!" حسن عسکری کہہ رہے تھے!

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا" ضمیر صاحب نے کہا اور اس خوشی میں جیب سے ٹیٹھے کی ایک قاش نکال کر حسن عسکری کو پیش کی۔ "لو منہ میٹھا کرو"

"نہیں یار میں پہلے ہی بہت موٹا ہو رہا ہوں"

تقریباً دو سو پاؤنڈ وزن کے حامل ضمیر صاحب نے اپنے **حبشے** پر ایک نظر ڈالی اور کہا "نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' آپ مجھے دیکھیں!"

حسن عسکری تو ہنس کر بات ٹال گئے' مگر میں نے ان دونوں کے حبشوں کی طرف دیکھا اور مجھے راجہ مہدی علی خاں اور الطاف مشہدی یاد آ گئے جو ایک دفعہ لڑتے جھگڑتے احمد ندیم قاسمی صاحب کے پاس "پھول" کے دفتر پہنچے اور ان سے داد رسی چاہی۔ تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ دونوں میں سے زیادہ موٹا کون ہے۔ راجہ مہدی علی خان کا دعویٰ تھا کہ وہ زیادہ موٹے ہیں جبکہ الطاف مشہدی موٹاپے میں اپنی فوقیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ جب قاسمی اس معاملے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ سنا سکے' تو طے پایا کہ سامنے لکڑیوں کے ٹال پر موجود "کنڈے" میں وزن

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ کنڈے کے ایک پلڑے میں راجہ مہدی علی خاں اور دوسرے میں الطاف مشہدی بیٹھ گئے۔ الطاف مشہدی کا پلڑا ایک طرف جھک گیا' چنانچہ دوسری طرف دس سیر کا باٹ رکھا گیا تو وزن برابر ہوا۔ اس پر الطاف مشہدی نے فخر سے راجہ مہدی علی خان کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھا' میں نہ کہتا تھا کہ میرا وزن زیادہ ہے!"

"نہیں تمہارا وزن زیادہ نہیں ہے" راجہ مہدی علی خاں نے کہا "تم کسی دن بغیر کھائے پیئے وزن کرکے دیکھو' تمہیں اندازہ ہو گا۔ کہ تم کتنا فالتو وزن اٹھائے پھرتے ہو!"

مگر یہاں تو معاملہ موٹاپے میں برابری کا تھا ہی نہیں' سو کنڈے تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی اور یوں یہ معاملہ ہی ختم ہو گیا!

یہ حیدر آباد ہے

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو حیدر آباد دکن کی سڑکیں اور عمارتیں ایک ایک کرکے تیزی سے میرے سامنے سے گزرتی جارہی تھیں۔ یہ ہے حیدر آباد دکن؟ میں نے دل ہی دل میں مایوسی سے کہا یہ تو بالکل عام شہروں جیسا ہے تاہم مجھے یوں لگا جیسے ضمیر جعفری نے میری خاموش صدا سن لی ہے!

"شہر سنگ و خشت کی بنی ہوئی عمارتوں سے نہیں' اپنے کردار سے پہچانے جاتے ہیں" جیسے ضمیر جعفری بھی خود کلامی کر رہے تھے۔ "اس سرزمین نے اورنگ زیب عالمگیر کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ قطب شاہی خاندان کا دور دیکھا ہے۔ اس میں ولی دکنی کی خوشبو ہے یہ سرزمین سلطنت آصفیہ کے سات فرمانرواؤں کی داستانوں کی امین ہے۔ یہ زمین نواب میر عثمان علی خان' مہاراجہ کشن پرشاد' یوسف علی خان سالار جنگ' سروجنی نائیڈو' بہادر یار جنگ' سر اکبر حیدری اور مولوی عبدالحق کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ یہ قاسم رضوی اور اس کے رضاکاروں کی سرزمین ہے۔ اقبال' مولانا ظفر علی خان اور ہمارے دوسرے ادبی مشاہیر کا رشتہ بھی اسی سرزمین سے رہا ہے۔"

ہم اس وقت سکندر آباد سے گزر رہے تھے' آگے حسین ساگر کا پل تھا' جس کے

دوسرے کنارے پر حیدر آباد ہے۔ "قاسم رضوی کے رضاکار یہیں کہیں ایک ایسی جنگ میں اپنی جانیں قربان کر رہے ہوں گے' جس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلنا تھا کیونکہ اس دور دراز علاقے میں تو اورنگ زیب کے پاؤں بھی نہیں جمے تھے۔ تین دنوں کے اندر اندر نظام کی فوجوں نے بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ جنرل چودھری نے اپنی فتح کا جشن یہیں کہیں منایا ہو گا!"

"ضمیر صاحب' تھوڑا سا پینتھا تو کھلائیں!" میں نے ان کی گفتگو درمیان میں روک کر کہا۔

"یار' وہ تو ختم ہو گیا ہے' ڈرائیور سے کہو کوئی مٹھائی کی دکان آئے تو کار تھوڑی دیر کے لئے روکے۔"

اور اب ہم حسین ساگر سے آگے نکل آئے تھے۔ اسلامی طرز تعمیر کی حامل شہر کی تاریخی عمارتیں کہیں کہیں اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ تیلگو کے اس خطہ زمین میں دکانوں کے سائن بورڈوں اور سنگ میل پر اردو کی عبارتیں نظر آئیں تو مجھے خوشگوار مسرت ہوئی۔ حیدر آباد شہر میں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں مگر یہ شہر آج بھی اپنے سابقہ اور موجودہ آثار کے حوالے سے بھارت میں اردو اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک جزیرہ ہے۔ تیلگو بولنے والوں کا تصادم اردو کے ساتھ نہیں ہندی کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اردو تاحال یہاں کی ایک اہم زبان ہے اور یا پھر انگریزی ایک بلند مقام پر فائز ہے۔ جس کا اندازہ اس شہر ہنروراں میں سات دن قیام کے دوران ہوا۔

شہر میں راماراؤ کی چالیس فٹ لمبی تصویریں لگی ہوئی تھیں "جواب آں غزل" کے طور پر اندرا گاندھی اور راجیو کی تصویریں بھی اسی سائز میں موجود تھیں۔ ایک علاقائی جماعت کے لیڈر نے ملک کی قومی جماعت کو نتھ ڈال دی ہے!

مکمل عورت سے ملاقات

اور پھر اس شہر میں میں نے مجتبیٰ کو یاد کیا۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

مجتبیٰ حسین بھارت کے چوٹی کے مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ وہ آج کل دہلی میں مقیم ہیں مگر ان کا تعلق بھی حیدر آباد سے ہے' بلکہ "زندہ دلان حیدر آباد" کی تشکیل اور پھر اس کی تعمیر میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے مگر نریندر لوتھر نے بتایا کہ وہ دہلی میں کانفرنس کے انتظامات میں مشغول ہیں۔ تاہم آج شام کو حیدر آباد پہنچ جائیں گے۔

"تو آج شام کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے ضمیر صاحب سے پوچھا۔

"تھانے جائیں گے۔ ارائیول ——"

"لاحول ولا قوۃ"

اور اس کے ساتھ ہماری کار ہوٹل سیمپورنا کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

حسن عسکری کی شیروانی اور ضمیر صاحب اور میرے' شلوار کرتے پر نظر پڑتے ہی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ایک دلکش خاتون نے بھرپور مسکراہٹ اور "ویل کم" کے پر خلوص لفظوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور پھر وہ کاؤنٹر سے نکل کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اسے ہماری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی اور اب وہ اپنے پاکستانی مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ سندور تھا اور گلاب کے پھول تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر سندور لگایا اور پھر تھال کو میرے گرد پھیرے دیئے حالانکہ میں نے سنا تھا کہ آگ کے گرد سات پھیرے مکمل کئے جاتے ہیں' مگر وہ غالباً شادی وغیرہ کے موقع پر ہوتا ہے۔ پھر اس دیوی نے مجھے ایک گلاب کا پھول پیش کیا اور اب گویا میری آرتی اتارنے کی رسم پوری ہو گئی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے دھڑکا تھا یعنی ضمیر جعفری اور حسن عسکری کی آرتی بھی اتاری گئی!

میں نے اس مکمل عورت کو ایک نظر دیکھا اور کہا "یہ سیمپورنا ہوٹل کا نام ہے یا

اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹی اور کہا "میرا نام پردھان!"

"پری دھان؟"

اس کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ ابھری "آیئے! میں آپ لوگوں کو آپ کے کمروں تک چھوڑ آؤں!"

میرا کمرہ پہلے فلور پر تھا اور ضمیر جعفری اور حسن عسکری تیسرے فلور پر تھے۔ بڑے آدمی جو ہوئے!

پہلے فلور پر لفٹ رکی تو پری دھان نے (میرے خیال میں یہی نام مناسب ہے) ضمیر صاحب اور عسکری صاحب سے کہا "آپ چلئے میں ابھی آتی ہوں"

میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پری دھان نے کہا "آپ کے لئے چائے کافی منگواؤں یا کوئی اور چیز پسند کریں گے۔"

"نہیں کچھ نہیں۔ شکریہ"

"آپ تکلف نہ کریں آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو' بتائیں"

نہیں میں تکلف نہیں کر رہا' آپ نے جس طرح ہمیں خوش آمدید کہا ہے' اس کے بعد واقعی کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہی!"

مجھے یہ دیوی اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے بھی بہت اچھی لگی' اس کے برتاؤ میں' اس کی منصبی خوش اخلاقی کے علاوہ ذاتی اخلاص بھی شامل تھا۔ حیدر آباد دکن کا "فرسٹ امپریشن" بہت اچھا تھا اور یہی میرا "لاسٹ امپریشن" بھی ثابت ہوا۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سامان سو برس کا ہے

میں نے کمرے میں موجود ٹیلی ویژن آن کیا اس پر ہوٹل کے سرکٹ سے کوئی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ میں اپنی پشاوری چپل سمیت فوم والے بستر پر دراز ہو گیا تاکہ تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کر لوں ——— اس پر مجھے اپنے ایک دوست یاد آ گئے جن کی کمر میں ایک بہت بڑا ابھار تھا۔ وہ جب بھی ہمارے ساتھ کسی دوسرے شہر میں مشاعرہ پڑھنے کے لئے جاتے کمرے میں پہنچتے ہی جوتے اتار کر ایک طرف رکھتے اور بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہتے "میں ذرا کمر سیدھی کر لوں" بس میں اس دن سے بامحاورہ زبان بولنے کے خلاف ہوں۔

میں نے کروٹ لیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر نظر ڈالی تو ہیرو کو ہیروئن کے ساتھ کچھ نازیبا حرکات میں مشغول پایا۔ میں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "میرا سامان؟"

اور اس کے ساتھ ہی لفٹ کا انتظار کئے بغیر دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے لابی میں پہنچ گیا۔

سامنے پری وھان کھڑی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر بارہ بجے دیکھے تو کہا "کیا بات ہے 'آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

"میرا سامان دوسری کار میں رہ گیا ہے"

"آپ کے بعد ایک کار آئی تو تھی مگر اس میں تو کچھ نہیں تھا!"

یہ پرائیویٹ کاریں تھیں 'خود منتظمین کو بھی ان کے ڈرائیوروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہو گا اور ان کے لئے میرے سامان کا کھوج لگانا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ سوچتے ہی میرے پسینے چھوٹ گئے 'کیونکہ میرے کپڑے 'کتابیں' پاسپورٹ وغیرہ سب کچھ اسی میں تھا ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارائیوال ڈیپارچر والا کاغذ بھی جس کی عدم موجودگی میں پانچ سال قید کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔

میں دوڑا دوڑا واپس اپنے کمرے میں گیا ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا "میں 128 نمبر کمرے سے بول رہا ہوں"

"بولو" آپریٹر نے کہا "بولو" لفظ فرمایئے "کا بدل تھا۔ پریشانی کے باوجود مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی "326 نمبر ملا دو"

"ابھی لو صاب"

میں نے ضمیر صاحب کو اپنی پریشانی بتائی۔ انہوں نے کہا تم نیچے لابی میں پہنچو 'میں بھی وہیں آتا ہوں!

اب میں اور ضمیر جعفری نیچے لابی میں بیٹھے سامان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب کوئی کار ہوٹل کے دروازے پر آ کر رکتی اور اس میں سے کوئی سامان نہ اترتا تو مجھے یوں لگتا میدان جنگ سے کوئی گھوڑا بغیر سوار کے آیا ہے!

میں اگر اسی کار میں بیٹھا رہتا جس میں میرا سامان تھا 'تو اس پریشانی سے بچ جاتا۔ میں نے "ضمیر" کی آواز پر کان دھر کر اپنے لئے اچھا نہیں کیا تھا!

ماتھے پر سرخ بندیا سجائے 'پھولدار ریشمی ساڑھی باندھے سفید رنگت اور بھرے بھرے جسم والی پری وھان ایک دفعہ پھر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سدا بہار مسکراہٹ تھی۔ میں نے بھی "جواب آں غزل" کے طور مسکرانے کی کوشش کی 'مگر کاغذ کے پھولوں سے خوشبو کس طرح آ سکتی ہے 'میرا دھیان تو اپنے سامان کی طرف تھا جس کی ابھی تک کوئی "سو" نہیں ملی تھی!

سامان کا کچھ پتہ چلا؟ پری وھان نے پوچھا۔

"نہیں"

مل جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔ اس میں پیسے وغیرہ تو نہیں تھے؟

"تھے!"

"پھر بھی مل جائے گا" مگر اس دفعہ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے؟" ضمیر جعفری نے کہا "تم نریندر لوتھریا طالب خوندمیری کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کرو' تاکہ وہ ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کر

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سکیں۔"

تجویز تو بہت اچھی ہے میں نے کہا "مگر میرے پاس ان میں سے کسی کا بھی فون نمبر نہیں ہے!"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" ضمیر صاحب نے کہا "اب ایک تجویز اور ہے!"

"وہ کیا؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہم اپنے کمرے میں چل کر سامان کا انتظار کرتے ہیں۔"

گو یہ تجویز بھی پہلی تجویز جیسی تھی' مگر میں نے اس ڈر سے کہ ممکن ہے ضمیر صاحب اس دفعہ اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار نہ ہوں' اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

چلئے! میں نے کہا۔

اور پھر ضمیر صاحب میرے کمرے میں تھے!

"تمہاری اردو شاعری بہت بے ہودہ ہے" میں نے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" ضمیر صاحب نے کہا "حتیٰ کہ تم بھی ٹھیک ٹھاک شعر کہتے ہو مگر تم یہ اردو شاعری پر غصہ کیوں اتار رہے ہو؟"

"میں تو مولانا حالی کی تائید کر رہا ہوں کہ ہمارے شاعر غیر حقیقی شعر کہتے ہیں اب دیکھیں یہ شاعر سامان کے ہونے پر اعتراض کرتے ہیں کہ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں' مگر بے سرو سامانی کے خلاف کچھ نہیں بولتے!"

"اچھا تو یہ بات ہے" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن ------"

مگر ان کی یہ "لیکن" درمیان میں ہی رہ گئی۔ کسی نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ شخص ایک بہت بڑا پیٹی نما "اٹیچی کیس" اٹھائے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

"میرا سامان آگیا" میں نے خوشی سے کھلکھلا کر کہا۔ یہ اٹیچی کیس میں نے تو

ابوظہبی میں مشاعرے کی کمائی سے خریدا تھا اور اب یہ حیدر آباد دکن میں دھکے کھاتا وفادار بلی کی طرح واپس مجھ تک پہنچ گیا۔ مجھے یہ گندے مندے سے شخص اس وقت کتنے اچھے لگ رہے تھے جی چاہتا تھا ان کی آرتی اتاروں' بلکہ اگر وہ کمرے میں داخل نہ ہو چکے ہوتے تو کم از کم دروازے پر تیل ضرور "چوتا!"

صاحب! ہمیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سامان کس کا ہے' بڑی مشکل سے پوچھتے پاچھتے یہاں تک پہنچے ہیں! ان "مہوشوں" میں سے ایک مہ وش نے کہا اور پھر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہے "صاحب! یہ بھاری بہت ہے۔"

اس میں "معاصر" کا ایک تازہ شمارہ ہے" ضمیر صاحب بولے۔

ان بچاروں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ سلام کرکے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر ان میں سے ایک کی طرف بڑھایا۔ پیشتر اس کے کہ میں ساتھ میں کچھ کہتا' ضمیر صاحب نے انہیں مخاطب کرکے کہا "ان پیسوں کا پیٹھا کھا لینا!"

حیدر آبادی بریانی

اس وقت رات کے نو بجنے کو تھے مگر اب تھکن نام کو نہ تھی۔

"کیا پروگرام ہے!" ضمیر صاحب نے پوچھا۔

پہلے کھانا کھاتے ہیں' پھر شہر کی سیر کو نکلتے ہیں!

اب ہم گراؤنڈ فلور پر ہوٹل کے ریستوران میں تھے۔

"ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین؟" ویٹر نے پوچھا!

انڈیا میں ہر جگہ کھانے سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا ہے یعنی آپ سبزی خور ہیں یا گوشت خور ہیں؟ حالانکہ سبزی خور اور گوشت خور کے ساتھ آدم خور بھی پوچھا جانا چاہئے کہ مذہب کے نام پر انسانوں کا خون پینے والے بھی بہت ہیں۔ یہاں دعوتوں میں بھی دو الگ الگ میزیں لگ جاتی ہیں' ایک سبزی خوروں کے لئے' ایک گوشت خوروں کے لئے ------ حالانکہ رش گوشت والی میز پر ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک ہندو دوست کیول لاہور میں میرے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ہاں مہمان ہوا۔ کھانے کی میز پر شامی کباب بھی تھے میں نے اسے باری باری ہر چیز چکھنے پر اصرار کیا مگر اس کے مذہبی معتقدات کے پیش نظر ان کبابوں کی دعوت نہیں دی' جبکہ وہ کھانا کھاتے ہوئے بار بار "تیری" آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "یہ کباب کس چیز کے بنے ہوئے ہیں؟" چنانچہ اس کے کہ میں اسے بتاتا کہ گائے کے گوشت کے ہیں اس نے ایک کباب اٹھا کر منہ میں ڈالا اور کہا "دیکھی جائے گی جو ہوئے گا!"

کھانا کھا کر ہم ہوٹل کی لمبی راہداری طے کر کے باہر سڑک پر آ گئے اور پھر منہ اٹھا کر بائیں جانب کو چلنا شروع کر دیا کیونکہ دائیں جانب والی سڑک پر خاصا رش تھا۔ معلوم ہوا ادھر صنعتی نمائش لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم ایک بہت بڑے چوراہے میں آ گئے۔ یہ معظم جاہی مارکیٹ تھی اور جس جگہ ہم کھڑے تھے یہ پھلوں کی منڈی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ یہاں فروری کے مہینے میں ہر موسم کے پھل موجود تھے۔ چنانچہ آم' انگور اور خربوزے بھی نظر آ رہے تھے' مگر یہ پھل سستی اور لاغری وغیرہ کا شکار تھے۔ وہاں ٹوکریوں میں جو آم دھرا تھا وہ اگرچہ لنگڑا آم نہیں تھا' مگر لگتا "لنگڑا" ہی تھا یہاں پھٹی پرانی سوتی ساڑھیوں میں ملبوس عورتیں زمین پر تربوز اور ناریل کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھیں۔ میں اور ضمیر صاحب مختلف دکانوں سے پھلوں کی قیمتیں معلوم کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ایک دکان سے اسی طرح قیمتیں معلوم کر کے آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ دکاندار نے روک لیا اور پھر اس نے اپنی سیلز مین شپ کے کچھ ایسے ناور نمونے پیش کیے کہ مجھے ایک کلو انگور خریدنے ہی پڑے۔ مجھے لگا کہ یہ سیلز مین اگر چاہے تو ایک اسکیمو کے ہاتھ فریج بیچ سکتا ہے!

مختلف سڑکوں پر مٹر گشت (براہ کرم اسے مٹر گوشت نہ لکھیں) کرتے ہوئے ہماری نظریں عمارتوں پر اٹھتیں تو ان میں اسلامی طرز تعمیر کی جھلک نمایاں نظر آتی۔ کئی جگہوں پر خوب صورت مسجدیں بھی نظر آئیں۔ دکانوں پر سائن بورڈ جا بجا اردو میں نظر آئے اور یہ منظر بھارت میں "ٹانواں ٹانواں" نظر آتا ہے۔ ایک جا بورڈ مارکہ ہوٹل پر نظر پڑی "مکہ ہوٹل!"

یہاں ایک "کڑک" چائے پینی چاہئے ضمیر صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر اس عوامی ریستوران میں داخل ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی حیدر آبادی بریانی کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر گئی جس طرح شیروانی حیدر آبادیوں کا قومی لباس ہے اسی طرح بریانی ان کی قومی ڈش ہے۔ اس بریانی کی لذت کا یہ عالم ہے کہ ایک سینہ گزٹ روایت کے مطابق دہلی کے ایک نواب زادے جو کسی شاہ عالم کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے' جب بستر مرگ پر پڑے تو انہوں نے آخری سانس لیتے ہوئے نہایت حسرت سے کہا کاش! اس وقت حیدر آبادی بریانی کے دو لقمے نصیب ہو جاتے۔

حیدر آبادی بریانی کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ حیدر آباد کے کسی امیر الامراء کی خدمت میں ایک ایسا باورچی پیش کیا گیا جو بریانی پکانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا خاص کر ایک ایسی بریانی پکاتا تھا جو لذیذ ہونے کے علاوہ مقوی بھی ہوتی تھی۔ اسے ملازم رکھ لیا گیا لیکن اس نے دو شرطیں پیش کیں۔

1- بریانی پکانے کا حکم ایک دن پہلے دیا جائے۔

2- جیسے ہی بریانی کی تیاری کا اعلان ہو' اسے فوراً کھا لیا جائے۔

یہ شرطیں منظور کر لی گئیں لیکن ایک دن اس نے حکم کے مطابق بریانی پکائی تو امیر الامراء صاحب مصروف تھے۔ باورچی کے مسلسل اصرار کے باوجود وہ دستر خوان پر نہ پہنچ سکے یہاں تک کہ بریانی ٹھنڈی ہو گئی۔ نواب صاحب کی وعدہ خلافی دیکھ کر باورچی کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بریانی کی دیگچی کو ایک خشک درخت کی جڑ میں الٹ کر مستعفی ہو گیا۔ دو تین روز بعد نواب صاحب اور ان کے مصاحبین یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ بریانی کے اثر سے اس خشک درخت میں نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ حیدر آبادی بریانی کی "فضیلت" کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بقول شاہد صدیقی کچھ لوگ حیدر آبادی بریانی کے مقابلے میں لکھنوی پلاؤ کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہی ہے جیسے انیس کے مقابلے میں دبیر کو کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"ایک پلیٹ بریانی!" ضمیر صاحب نے ہوٹل بوائے احمد کو آرڈر دیا!

بریانی کھا کر میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک انگڑائی لی "اب کیا کیا جائے؟ یہاں تو کوئی خشک درخت بھی نہیں ہے!"

"چائے پیتے ہیں!" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

ریستوران سے نکلتے ہوئے میں نے احمد کو ایک کلو انگور والا لفافہ پیش کیا حالانکہ اس بچارے نے ہمیں بریانی کھلائی تھی!

حیدر آباد نگینہ 'اندر مٹی اوپر چونا

حیدر آباد کے متعلق ایک کہاوت مشہور ہے "حیدر آباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا"۔ یہ کہاوت اس شہر کے سماجی تضاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مگر اس کے نگینہ ہونے کی وضاحت حیدر آباد پر متعدد مضامین کے مصنف شاہد صاحب نے اس طرح کی ہے کہ جو لوگ سفر کرتے رہتے ہیں اور جن کی عمر سیاحی میں گذرتی ہے ان کے بیانات کی روشنی میں دہلی کا رنگ سفید ہے کلکتہ کا سیاہ بمبئی کا آسمانی' لکھنؤ کا سبز' آگرے کا زرد' الہ آباد کا قرمزی بنارس کا انگوری اور مراد آباد کا فاختی لیکن حیدر آباد کا معاملہ جداگانہ ہے۔ اس شہر کا کوئی رنگ نہیں بلکہ اس میں رنگ کی بجائے ایک طرح کی چمک ہے جو دور سے سمجھ نہیں آتی۔ اور قریب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ چمک دائیں بائیں آگے پیچھے اور نیچے غرض کہ ہر طرف پائی جاتی ہے۔ ہر موسم میں پائی جاتی ہے ہر وقت پائی جاتی ہے بلکہ اس وقت بھی پائی جاتی ہے جب چراغ بجھ جاتے ہیں اور ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا!

اس وقت چراغ بجھے ہوئے ہیں اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا مگر حیدر آباد واقعی نگینے کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک بجھے ہوئے چہرے اور سفید داڑھی والا بزرگ سائیکل رکشہ چلاتے ہوئے میرے قریب سے گزرتا ہے مگر مجھے اس کے چہرے پر بھی ایک امید' ایک یقین کی چمک نظر آتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے واپس ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے مجھے یہ شہر خوب صورت لگ رہا تھا۔ روشن اور تابندہ! میں نے سنا تھا کہ شہر اپنی پہچان آہستہ آہستہ کراتے ہیں'

مگر مجھے تو ابھی سے لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اس شہر میں بس رہا ہوں۔

ہمدم دیرینہ کا ملنا

ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے تو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا' ارے یہ تو غیاث متین ہیں' ن۔ م۔ راشد پر تحقیقی مواد کی تلاش میں لاہور آئے تھے اور پھر ان سے کتنی ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نہایت خوب صورت شاعر۔ ان کی شاعری نے تو لاہور کے ادبی حلقوں میں خود کو بڑے زوروں سے منوایا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا اور بغل گیر ہو گیا۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان علی الدین نوید بھی تھے۔ اچھے نین نقش' ننھی منی داڑھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ نوجوان وہی علی الدین نوید ہیں' جن کا شعری مجموعہ "صدف تمام ریت ریت" غیاث میرے لئے اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں آگے بڑھا اور ان سے "بچھی" ڈال کر ملا۔

ضمیر صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے اور پھر سونے کے لئے اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے' مگر میں غیاث متین اور علی الدین نوید بہت دیر تک لابی میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ غیاث لاہور کو یاد کرتے رہے اور لاہوریوں کی دن کے تمام اوقات میں کھانے پینے کی عادات کا ذکر کر کے ہنستے رہے۔

اب میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی اور خود غیاث اور نوید کی آنکھیں بھی میں نے دو تین دفعہ کھلتی اور بند ہوتی دیکھیں۔ سو تھوڑی دیر بعد انہوں نے رخصت چاہی اور پھر میں اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ صبح آٹھ فروری تھی' عالمی طنز و مزاح کانفرنس کا پہلا دن! مجھے صبح اٹھنا بھی جلدی تھا کیونکہ ہمیں لینے کے لئے نو بجے گاڑی ہوٹل پہنچ جانی تھی۔

صاحب! ہم شریف آدمی ہے

آپریٹر نے حسب ہدایت صبح سات بجے فون کی گھنٹی بجا کر جگایا تو یاد آیا کہ کپڑے تو استری ہونے والے ہیں۔ میں نے ہوٹل کے ملازم کو بلایا وہ آکر مودب کھڑا ہو گیا۔

"استری کا بندوبست ہو سکتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

یہ سن کر اس کے کان کی لویں ایک دم سرخ ہو گئیں اور پھر اس نے کہا "صاحب! ہم ایسا آدمی نہیں، ہم شریف لوگ ہے!"

میں اس کی بات سن کر سٹپٹا گیا مگر پھر مجھے یاد آیا کہ ہندی میں استری گھر والی کو کہتے ہیں۔ صورت حال کی مضحکہ خیزی کا سوچ کر بے اختیار میری ہنسی نکل گئی!

شہر کے درمیان میں خاصی بلندی پر واقع رویندر بھارتی ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ آج عالمی طنز و مزاح کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ سٹیج پر کانفرنس کے منتظمین کے علاوہ امریکہ، روس، چین، بنگلہ دیش، سوئٹزرلینڈ، مصر، بلغاریہ، نیپال، جرمنی، ملائیشیا، جاپان، ارجنٹائن، برطانیہ، فرانس اور جنوبی کوریا وغیرہ کے مزاح نگار بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے دھری میز پر ان کے ملکوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ان میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بھی تھا اپنے ملک اپنے پرچم اور اپنی قوم سے وابستگی اور افتخار کا احساس بیرون ملک جس طرح بیدار ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ سو ان لمحوں میں جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس پرچم کو چوم لوں جو یہاں بھی ہماری پہچان ہے۔ مگر یہاں صرف "فلائنگ کس" ہی ممکن تھی۔ سو میں نے اپنے پرچم کا "ہوائی بوسہ" لیا اور پھر اسٹیج پر موجود دوسرے معززین کو پہچاننے کی کوشش کی اور ظاہر ہے میری یہ سعی سعی رائیگاں ہی کی ذیل میں آتی تھی تاہم یہاں میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست نے میری رہنمائی کی اور تب میں نے جانا کہ اسٹیج کی اگلی رو میں بھارت کی لوک سبھا (قومی اسمبلی) کے اسپیکر بلرام جاکھر بیٹھے ہوئے ہیں وہی بلرام جاکھر جن سے حیدر آباد ائیرپورٹ پر ہمارا "ٹاکرا" ہوا تھا اور حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ان کے لئے جمع شدہ استقبالی مجمعے کو ہم اپنا استقبالی مجمع سمجھ کر آبدیدہ ہو گئے تھے۔ ان کے برابر میں ریاستی وزیر صحت (جن کی صحت کچھ اتنی اچھی نہیں تھی) اور صدر عالمی مزاح کانفرنس مسٹر آنند گجپتی راجو ایم پی تھے۔ ان کے علاوہ چیف سیکریٹری شراون کمار تھے کانفرنس کے ورکنگ صدر نریندر لوتھر اور جنرل سیکرٹری طالب خوندیری بھی یہاں موجود تھے۔ دوسری قطار میں غیر ملکی مندوبین اور ان کے ساتھ بھارت کی

پندرہ زبانوں کے مزاح نگار تشریف فرما تھے۔ یہاں حکومت پاکستان کی نمائندگی ہمارے سفارت خانے کے منسٹر انفارمیشن حسن عسکری کر رہے تھے۔ میں اور ضمیر جعفری قدرے تاخیر سے ہال میں پہنچے تھے۔ چنانچہ جب ہم انسانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے اس ہال میں داخل ہوئے اس وقت وینکٹ راما ریڈی وومنیز کالج کی طالبات اقبال کا ترانہ ہندی"

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

گا رہی تھیں ہندوستان اور پاکستان دونوں اقبال کے عاشق ہیں فرق بس اتنا ہے کہ وہ اقبال کی ابتدا اور ہم اس کی انتہا کے پرستار ہیں۔ یہ لڑکیاں "ترانہ ہندی" گا کر فارغ ہوئیں تو ایک بار پھر ہاتھوں میں ہار اور گجرے لے کر اسٹیج پر نمودار ہوئیں اور مہمانوں کے لئے گل پوشی کی رسم ادا کی بھارت میں گل پوشی کی یہ رسم بہت عروج پر ہے۔ ہر تقریب میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور یہ اچھا لگتا ہے چنانچہ یہاں کسی مہمان کو بھی۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برا انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

والا شعر پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ "گل مراد" اس کے بغیر ہی ہاتھ آجاتا ہے۔

اور اب تقریب کے مہمان خصوصی بلرام جاکھر اس عالمی مزاح کانفرنس کے افتتاح کے لئے اپنی جگہ سے اٹھے اور جونہی انہوں نے شمع روشن کی ہال میں چاروں طرف سے قہقہے گونجنے لگے یہ دراصل قہقہوں کی ٹیپ تھی جو آن کر دی گئی تھی۔ بلرام جاکھر اندرا گاندھی کے آدمی ہیں اور جس صوبے میں وہ مہمان تھے۔ وہ ان کے حریف راما راؤ کا تھا سو ممکن ہے ایک دفعہ وہ یہ سوچ کر ہل گئے ہوں کہ راما راؤ کے "عوام" انہیں "ہوٹ" کرنے کے لئے قہقہے لگا رہے ہیں مگر یہ میرا اپنا وہم تھا کیونکہ بھارت میں اتنی جمہوری اور سیاسی رواداری کم از کم بالائی سطح پر موجود ہے کہ حکومتی پارٹی کا لیڈر اپوزیشن کے علاقے میں بھی مکمل عزت و تکریم کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے۔ افتتاحی شمع روشن کرنے کے بعد بلرام جاکھر نے انگریزی میں تقریر کی۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

دوران تقریر انہوں نے ایک دفعہ سامعین سے اردو بولنے کی اجازت بھی طلب کی مگرہال کے ایک گوشے سے "نہیں" کی آواز سن کروہ دوبارہ انگریزی میں رواں ہو گئے مسٹر جاکھر کی تقریر اتنی پر لطف تھی کہ انہوں نے خود کو اس کانفرنس میں مہمان خصوصی بنائے جانے کا مستحق قرار دے دیا صوبائی وزیر صحت آنند گجپتی نے اپنی صدارتی تقریر کو مختصر ہی رہنے دیا اور ان کی یہ اختصار پسندی سامعین کو اچھی لگی۔

طنزو مزاح کی اس عالمی کانفرنس کے موقع پر حکومت ہند کے محکمہ ڈاک نے ایک یادگاری ٹکٹ اور لفافہ بھی جاری کیا تھا۔ یادگاری ٹکٹ پر چارلی چپلن کی تصویر تھی اور اس کے برابر میں ایک دلچسپ کارٹون بنا ہوا تھا اس کے علاوہ اس موقع کی مناسبت سے ایک سوونیئر بھی شائع کیا گیا تھا اور یہ دونوں یادگار تحفے یہاں مہمانوں میں تقسیم کئے گئے۔

نریندر لوتھر کا ڈرامہ

"زندہ دلان حیدر آباد" کے صدر نریندر لوتھر جو ایک ممتاز مزاح نگار یا ریاست کی اردو اکیڈمی کے ایک عہدیدار ہی نہیں ریاستی محکمہ صحت کے پرنسپل سیکرٹری بھی ہیں اس کانفرنس میں "وج گج" کر سامنے آئے۔ ان کی تقریر بہت "کھڑکے دڑ کے" والی تھی۔ تقریر کا ذکر تو ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے آپ کو یہ بتالیں کہ وہ تقریب کے آغاز میں اسٹیج پر نمودار ہوئے تو انہوں نے چہرے پر ماسک پہنا ہوا تھا جو اس کانفرنس کا مونوگرام بھی ہے۔ انہوں نے آتے ہی یہ ماسک اتارا اور کہا ہمارا نصب العین صرف یہی ہے۔ کہ ہم سب اپنے اپنے چہروں سے سنجیدگی کے وہ ماسک اتار دیں جو ہم نے پہن رکھے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ہم زندگی کی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں۔ انہوں نے یہاں جو تقریر کی اسے انہوں نے "منشور قہقہہ" کا نام دیا اور ہمیں اس تقریر کا یہ حصہ خصوصاً" بہت دلچسپ لگا جس میں انہوں نے ڈاکٹروں کے حوالے سے بتایا کہ مسکراہٹ چہرے کے تین عضلات کو متاثر کرتی ہے۔ معمولی ہنسی نتیس عضلات کو اور بھرپور قہقہہ اسی عضلات کو متاثر کرتا ہے۔ ایک فزیالوجسٹ کا کہنا ہے کہ قہقہہ جسم میں ایسا مادہ پیدا کرتا ہے جو جسم کی کارکردگی کو توانائی بخشتا ہے۔ نریندر لوتھر نے بتایا کہ پچھلے

دنوں اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی جس کے مطابق انڈر نامی ایک لڑکا ورجینا (امریکہ) میں بغیر دماغ کے پیدا ہوا وہ رو تو سکتا تھا لیکن ہنس نہیں سکتا تھا لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو ہنسنے یا مسکرانے کے لئے دماغ کی ضرورت ہے۔

تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر آنند راج ورما حمایت اللہ اور مصطفےٰ علی بیگ نے مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کیا طالب خوند میری نے شکریہ ادا کرنے کا "خوشگوار" فریضہ انجام دیا۔ واضح رہے ان میں سے کچھ حضرات نیز مدیر سیاست جناب عابد علی خاں مدیر "شگوفہ" سید مصطفےٰ کمال اور مجتبیٰ حسین اس کانفرنس کے بانیوں میں سے ہیں اور اس سلسلے کی پہلی کانفرنس انہوں نے حیدر آباد میں ہی 1964ء میں منعقد کی تھی اور آج اس کانفرنس نے ایک عظیم الشان بین الاقوامی تقریب کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے سلسلے میں بتانے کی ایک بات یہ ہے کہ اس کی ساری کارروائی انگریزی میں ہوئی یعنی اردو ہندی دونوں کو لال جھنڈی دکھائی گئی۔ حاضرین کے (Response) سے بھی اندازہ ہوا کہ انگریزی ان کے گھر کی لونڈی ہے بلکہ بقول جوش ملیح آبادی وہ اس کے ساتھ سلوک بھی لونڈیوں والا ہی کرتے ہیں خیر یہاں تو انگریزی کا راج چلنا ہی تھا کیونکہ یہ بین الاقوامی کانفرنس تھی اور یوں انگریزی نے یہاں رابطے کی زبان کا کام دیا۔ لیکن حیدر آباد میں سات دن قیام کے دوران انگریزی کی بالادستی کے اور بھی بہت سے نمونے نظر آئے۔ اور اس میں غالباً" حب علی سے زیادہ بغض معاویہ کار فرما ہے کیونکہ یہاں تیلگو ہندی تنازعہ کی فضا موجود ہے۔

ایک نہایت دلچسپ آئٹم کا ذکر تو میں بھول ہی گیا پروگرام کے دوران کلکتہ کے مائم آرٹسٹوں شنکر داس گپتا اور نرنجن گوسوامی نے کوئی لفظ ادا کئے بغیر محض جسمانی حرکات و سکنات سے مزاحیہ آئٹم پیش کئے یہ دونوں آرٹسٹ بہت شہرت کے مالک ہیں۔

مسائل مزاح سے نہیں سنجیدگی سے حل ہوں گے

افتتاحی اجلاس کے اختتام پر مختلف زبانوں کے مزاح نگاروں کے الگ الگ گروپ بنا

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کران کے کنوینر مقرر کر دیئے گئے تھے تاہم یہ داستان ہم ذرا تاخیر سے بیان کریں گے کیونکہ ایسا ہونے میں ویسے بھی تاخیر ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سامعین مہمانوں سے شوق ملاقات میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے اور ان کے علاوہ مندوبین تھے جو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے یعنی معانقہ کر رہے تھے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن والے الگ تھے۔ جو مندوبین سے کانفرنس کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھ رہے تھے۔ ایک ٹیلی ویژن کیمرے کی روشنی مجھ پر پڑی اور پھر ایک مائیک میری طرف بڑھا "کانفرنس کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنی نوعیت کی بالکل منفرد کانفرنس ہے اور شاید اتنے بڑے پیمانے پر پوری دنیا میں پہلی بار ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے منتظمین کو اس کانفرنس کے انعقاد پر جتنی مبارک دی جائے کم ہے۔"

"آپ اور سید ضمیر جعفری کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی کانفرنسیں دونوں ہمسایہ ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ممد معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟"

"میرے خیال میں اس قسم کی کانفرسیں باہمی محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیتی ہیں تنگ نظری کی بجائے کشادہ دلی پیدا کرتی ہیں۔ اور اس عالمی مزاح کانفرنس سے یقیناً دلوں کی کدورتوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی تاہم میرے خیال میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے مزاح سے زیادہ سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔" اور اب ٹیلی ویژن کیمرہ سید ضمیر جعفری پر تھا۔ ضمیر صاحب نے اپنے تاثرات ریکارڈ کرواتے ہوئے پہلے تو کانفرنس کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انہوں نے ہماری جو عزت افزائی کی ہے یہ دراصل ہمارے ملک کی عزت افزائی ہے۔ ضمیر صاحب نے زندہ دلان حیدر آباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس کو ایک عظیم الشان تجربہ قرار دیا اور کہا کہ یہ اپنی نوعیت کی واحد کانفرنس ہے جس میں چھوٹے بڑے سب ہی ملکوں کے مزاح نگار ایک ہی گھاٹ پر پی رہے ہیں۔

مصطفےٰ کمال کا کمال

اس اثناء میں سامعین سٹیج پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے مندوبین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین مندوبین کو ان کے گھیرے سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس ہال میں مندوبین کو ایک دوسرے سے تعارف کرانے کے لئے ان کے علیحدہ مل بیٹھنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ایک نوجوان کے چہرے پر داڑھی اور عینک تھی۔ ناٹا سا قد اور سانولا سا رنگ تھا میرے پاس آئے اور گرمجوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ یہ مسیح انجم تھے۔ میں نے حیدر آباد سے سید مصطفیٰ کمال کی زیر ادارت پابندی سے شائع ہونے والے "شگوفہ" میں ان کے شگفتہ مضامین پڑھ رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے احباب کے گھیرے میں سے نکالتے ہوئے کہا "اس طرح تو آپ شام تک یہیں کھڑے رہیں گے میں اس کانفرنس میں شریک اردو کے ادیبوں کا کنوینر ہوں۔ چلئے آپ کو باقی مندوبین سے ملواتا ہوں" اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے یہ قہقہہ اپنی آنکھوں سے مسیح انجم کے حلق سے نکلتے دیکھا تھا مگر مسیح انجم کے چہرے پر اس کے کوئی "آثار" نہ تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوع کا قہقہہ دراصل مسیح انجم کا "تکیہ کلام" ہے۔ چنانچہ اس کے کہ یہ پر خلوص نوجوان مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوتا میرے سامنے سید مصطفیٰ کمال کھڑے تھے۔ گورے چٹے چہرے پر عینک اور مسکراہٹ سجائے ہوئے اور پھر میں نے سات دن تک سخت افراتفری کے عالم میں بھی انہیں اسی طرح مسکراتے دیکھا۔ سید مصطفیٰ کمال خدا کرے تم ساری عمر اسی طرح مسکراتے رہو اور لوگوں کے چہروں پر اسی طرح مسکراہٹیں بکھیرتے رہو۔ اور اب ان سے ملیں یہ ڈاکٹر بیگ احساس ہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار، کرشن چندر پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے کتنے ہی انکشافات کر ڈالے مثلاً یہ کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی طرح کرشن چندر کی جائے پیدائش بھی وہ نہیں ہے جو وہ بتاتے ہیں۔ یا یہ کہ برصغیر کے ممتاز انشاء پرداز رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی سے شادی کے لئے کرشن کے مسلمان ہونے کا افسانہ بس افسانہ ہی ہے اور یہ بھی کہ پوری

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کوشش کے باوجود وہ نکاح نامہ نہ دیکھ سکے جو سلمٰی صدیقی کے بقول ان کی والدہ کے پاس موجود ہے۔ بیگ احساس کے ساتھ ذہانت بیگ ہیں۔ حیدر آباد سے نکلنے والے ہندوستان کے وقیع اردو روزنامہ "سیاست" کے سب ایڈیٹر۔ دونوں خوبصورت نوجوان اور دوسرے سب دوستوں کی طرح محبت سے لبالب بھرے ہوئے۔ اور اب میں حمایت اللہ سے مل رہا ہوں۔ یہاں کے "منے تنے" مزاحیہ شاعر اللہ جانے وہ واقعی اتنے لمبے ہیں جتنے نظر آتے تھے یا آج اس کانفرنس کے لئے خصوصی اہتمام کر کے آئے تھے۔ طنز و مزاح کانفرنس کی بھاری ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر بھی ہیں۔ جو بہرحال ناتواں کندھے نہیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین اور مس گیلینا!

اور لو مجتبیٰ حسین بھی یہیں مل رہے ہیں موصوف کل شام کو حیدر آباد پہنچے اور ملاقات اس ہجوم میں ہو رہی ہے۔ ابراہیم جلیس اور محبوب حسین جگر کے اس "برادر خورد" سے میری غائبانہ دوستی 1979ء میں ہوئی تھی جب احمد حسن حامد کی دہلی یاترا کے دوران اس نے اپنی کتابیں اور سلام میرے لئے بھجوایا تھا۔ اس کے بعد جب مجھے دو دفعہ بھارت جانے کا اتفاق ہوا تو پے در پے اتنی طویل ملاقاتیں ہوئیں کہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے۔ اس دوران میں نے ایک چھوٹے سے قد کے بنگالی نوجوان کو دیکھا۔ یہ کون ہے؟ یہ بنگلہ دیش کے خوندکر علی اشرف ہیں۔ اتنی محبت سے بغل گیر ہوئے کہ سب گلے شکوے جاتے رہے یہ "طنز و مزاح" بلغاریہ کے ڈائریکٹر مسٹر سٹیفن ہیں۔ ان کے ساتھ خوبصورت خدو خال والی مس گیلینا ہیں۔ ان کا تعلق بھی بلغاریہ کے "ہاؤس آف ہیومر اینڈ سیٹائر" سے ہے آنے والے سات دنوں میں جو مزاح نگار اس خوبصورت خدو خال والی مس گیلینا کو دیکھتا تھا سیریس ہو جاتا تھا روسی مزاح نگار مسٹر آندرے بھی یہاں "گواچی ہوئی گاں" کی طرح پھر رہے ہیں کیونکہ گفت و شنید میں زبان آڑے آ رہی ہے۔ انگریزی سے نابلد ہیں گویا "اردو میڈیم" ہیں۔

اب مسیح انجم کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر پہلے ضمیر جعفری کے پاس

لے کر جاتے ہیں جو ہجوم عاشقان میں گھرے ہوئے ہیں اور پھر مجھے ان کی "بنی" پکڑنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مسیح انجم مجھے اور میں ضمیر صاحب کو تھامے ہوئے سٹیج سے نیچے اتر کر ہال کی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھتا ہوں جہاں بھارت کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مزاح نگار پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں اردو کے صف اول کے طنز نگار فکر تونسوی ہیں۔ جنہیں پڑھ پڑھ کر مجھ ایسوں نے قلم ہاتھ میں پکڑنا سیکھا ہے۔ یوسف ناظم ہیں۔ نامور افسانہ نگار جوگندر پال اور ان کی بیگم کرشنا پال ہیں۔ لوگندر بالی ہیں۔ شفیقہ فرحت ہیں۔ پرویز عبداللہ مہدی' جہاں قدر چغتائی' ڈاکٹر حبیب ضیاء' رشید قریشی اور مجتبیٰ حسین ہیں۔ سردار دیلپ سنگھ بھی یہاں ہیں۔ سرداروں جیسے حسن طبیعت کے مالک۔ دہلی سے آئے ہیں یہاں راج نرائن راز سے بھی ملاقات ہوئی۔ خوبصورت شاعر اور خوبصورت باتیں کرنے والا شخص "آج کل" کا ایڈیٹر ہے اور ان کے علاوہ یہاں کتنے ہی دوست ہیں اردو کے بزرگ مزاح نگار احمد شجاع پاشا کی کمی یہاں محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ دیر ان دوستوں سے گپ شپ ہوتی ہے اور پھر یہ قافلہ چٹکلوں' لطیفوں اور قہقہوں کی رفاقت میں لنچ کے لئے جوبلی ہال کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ جہاں باغ عامہ میں سٹیٹ بنک آف انڈیا کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

پنجاب کے سرداروں نے بائیکاٹ کیا

اور یہاں کتنے ہی اور دوستوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یعنی ڈاڑھی والے "ہندوستان ٹائمز" کے کارٹونسٹ اور طنز نگار سوشیل اور ٹائمز آف انڈیا کے لکشمن بھائیا۔ یہ لکشمن بھائیا بڑا مسخرہ نوجوان ہے۔ سندھی ہے فکر تونسوی کے ساتھ لاہور آیا تھا تعارف لاہور میں ہوا تھا بے تکلفی حیدر آباد میں ہو گئی۔ ان کے علاوہ ایک بزرگ تارا سنگھ کامل سے بھی یہیں تعارف ہوا۔ مگر پتہ چلا کہ یہ بزرگ ہم "مبینہ" نوجوانوں سے زیادہ زندہ دل ہے۔ یہ بزرگ بعد کی ملاقاتوں میں لطیفہ گو بھی ثابت ہوا۔ اور لطیفہ ساز بھی! سردار دیلپ سنگھ اور موصوف یعنی سردار تارا سنگھ کامل کانفرنس کے دنوں میں الجبرے اور جیومیٹری کی طرح

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ساتھ ساتھ رہے۔ اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں پنجاب سے کوئی وفد نہیں آیا تھا (متذکرہ دونوں سردار دہلی میں مقیم ہیں)۔

شاید سردار من حیث القوم ابھی ہنسنے کے موڈ میں نہیں ہیں کیونکہ ان کا غصہ فرد نہیں ہوا۔ انفرادی سطح پر ان میں خوش طبعی کا جوہر موجود ہے، مگر اچانک انکی آنکھوں میں ویرانیاں سی جھانکنے لگتی ہیں۔

جس ہال (جوبلی ہال) میں ظہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا اس ہال کی تعمیر سلطنت آصفیہ کے آخری تاجدار میر عثمان علی خاں نے اپنی حکومت کے پچیس سال مکمل ہونے پر کروائی تھی چنانچہ یہاں دیواروں پر اس تاریخی واقعے کے حوالے سے بنائی گئی پینٹنگز آویزاں تھیں ان کے علاوہ میر عثمان علی خاں اور دوسرے فرمانراؤں کی بڑی بڑی تصویریں یہاں لگی تھیں۔

حیدر آباد کی کشور ناہید

اس دوران کھانے کا نقارہ بجا تو مہمان اپنی نشستوں سے اٹھے اور ایک بار پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا نان ویجیٹرین ایک طرف اور ویجیٹرین دوسری طرف لگی میری طرف چلے گئے میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ رامپوری ٹوپی پہنے۔ شیروانی اور پاجامے میں ملبوس ہاتھ میں پلیٹ لئے مجمع چھٹنے کے منتظر ہیں۔ یہ ظ انصاری تھے اردو کے معروف نقاد اور ادیب۔ جن سے اپنے بھی خفا اور بیگانے بھی ناخوش رہتے ہیں اور ایک چالیس بیالیس سالہ خاتون جن کی ساڑھی کا پلو بار بار فراز سے نشیب کی طرف ڈھلک ڈھلک جاتا تھا اور جو کبھی یقیناً بہت خوبصورت رہی ہوں گی کیونکہ آثار یہی بتا رہے تھے۔ کھانے کے دوران جوگندر پال سے محو گفتگو تھیں۔ یہ لکشمی دیوی تھیں۔ جوگندر پال نے بتایا کہ یہ حیدر آباد کی تہذیبی اور ادبی زندگی کی جان ہیں۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ یہ یہاں کی کشور ناہید ہیں۔ جوگندر پال کے اس تعارف کے بعد شوق ملاقات فزوں ہوا۔ مگر بعد میں حیدر آباد والوں کی بے پناہ مہمان نوازیوں نے تفصیلی ملاقات کی حسرت پوری نہ ہونے دی۔

میں کھانے سے فراغت کے بعد ایک صوفے پر جا بیٹھا تھا اور تلگو روزنامہ "اندھیرا

پرھا" کے سینئر سب ایڈیٹر پی ان سوامی سے گپ شپ میں مشغول تھا کہ ضمیر جعفری میرے پاس آئے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ضمیر صاحب سے کہا "چلیں اب واپس اپنے ہوٹل چلتے ہیں تھوڑا سا آرام کریں گے کیونکہ شام کو نواب شاہ عالم خاں کے عشائیے میں جانا ہے کہنے لگے بس ذرا کھانا کھالوں تو چلتے ہیں میں نے انہیں حیرت سے دیکھا مگر پھر مجھے یاد آیا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں انہوں نے ابھی ویجیٹرین کھانا کھایا ہے نان ویجیٹرین کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ سو ضمیر صاحب حوصلہ افزائی کی غرض سے نان ویجیٹرین میزوں کی طرف بھی گئے۔

قریباً" تین بجے سہ پہر واپس ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ضمیر صاحب نے بیگ احساس سے کہا "اگر یہاں کوئی عینکوں کی دوکان ہو تو کار رکوائیں۔ میری عینک گم ہو گئی ہے۔ اور کل مجھے اردو سیشن میں مضمون پڑھنا ہے" عینکوں کی دکان پر کھڑے ایک صوفی صاحب نے ضمیر صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا مگر معذرت کی کہ عینک ایک دن میں نہیں بن سکتی۔ آپ فی الحال کوئی محدب شیشہ خرید لیں اور اس سے کام چلائیں۔ یعنی بالکل اس دوکاندار کی طرح جس سے گاہک نے بلیڈ مانگا تھا اور دوکاندار نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا "معافی چاہتا ہوں جناب بلیڈ تو نہیں ہے آپ ریگ مار لے جائیں" مگر ضمیر صاحب نے تو واقعی محدب شیشہ خرید لیا۔ گو انہیں اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ حسن عسکری صاحب نے انہیں اپنی ایک سپیئر عینک مستعار دے دی۔

ڈراؤنا خواب

ضمیر صاحب بجائے اپنے کمرے میں جانے کے میرے کمرے ہی میں چلے آئے تھے اور اب سارے دن کے تھکے ہوئے میرے برابر والے بستر میں لیٹے خواب استراحت کے مزے لے رہے تھے۔ میں بھی بستر پر لیٹتے ہی سو گیا تھا لیکن ابھی ہمیں سوئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے چنانچہ میں نے ہڑبڑا کر اپنے بستر سے چھلانگ لگائی اور ضمیر صاحب کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "ضمیر صاحب، ضمیر صاحب!"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ضمیر صاحب گھبرا کر اٹھ بیٹھے "کیا ہوا؟"

"ہمیں حیدر آباد پہنچے ہوئے چوبیس گھنٹے ہونے کو ہیں" میں نے پھولی ہوئی سانس سے کہا "مگر ہم نے ابھی تک تھانے میں جا کر ارائیوال نہیں لکھوائی۔"

اس دفعہ ضمیر صاحب نے بستر سے چھلانگ لگائی۔ میز پر پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں پڑی بتیسی اٹھا کر منہ میں رکھی سر پر ٹوپی دھری اور کہا "جلدی تھانے چلو پانچ سال قید ہے!"

یہ تھانہ تو نہیں انٹیلی جنس کا دفتر تھا جس کھڑکی سے ہم نے اپنی ارائیول لکھوانی تھی اس کے باہر ایک تختی پر "صیغہ اجانب" لکھا تھا۔ حیدر آباد میں اردو کی یہ بالادستی اس سچوایشن میں بھی اچھی لگی۔ دہلی میں تو ہم پانچ منٹ میں اس "کارِ خیر" سے فارغ ہو گئے تھے مگر یہاں ہم سے اتنی درخواستیں لکھوائی گئیں اور اتنے فارم بھروائے گئے کہ پورے دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ گویا اندھرا پردیش میں میں قائم رامارا ؤ کی اپوزیشن حکومت نے مرکز کی مخالف حکومت کو جتلا دیا تھا کہ یہاں ہم سچ مچ کی اپوزیشن ہیں تم نے اگر غیر ملکی مہمانوں کے لئے آسان پروسیجر اپنایا ہے تو اپنائے رہو۔ ہم تمہاری پیروی بہر حال نہیں کریں گے۔ تاہم اس تکلیف دہ صورت حال کے دوران ایک واقعہ پر لطف بھی ہوا۔ کلرک نے ہماری اردو میں لکھی گئی درخواست کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کہا "یہ ذرا پڑھ کر بھی سنا دیں تاکہ پتہ تو چلے کہ آپ نے لکھا کیا ہے؟" اس پر مجھے اپنے ہاں کے ایک دفتر کے کلرک یاد آ گئے۔ موصوف انگریزی کے معاملے میں بالکل کورے تھے۔ مگر اس کلرک کے برعکس وہ اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے پاس انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی درخواست جاتی تو وہ عینک لگاتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے وہ اس کا ایک ایک لفظ پورے غور سے پڑھ رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ عینک اتارتے درخواست پر پیپر ویٹ رکھتے اور درخواست گزار کو مخاطب کر کے کہتے "تمہاری درخواست تو میں نے پڑھ لی ہے اب تم مختصراً مجھے بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

یہ بطخ کہاں سے آ گئی؟

یہاں سے فراغت پا کر شام کو چھ بجے کے قریب ہوٹل پہنچے تو کاؤنٹر کلرک نے کتنے ہی احباب کے رقعے ہمارے سپرد کئے۔ جو ہمیں ہوٹل میں نہ پا کر لوٹ گئے تھے تھوڑی دیر بعد ہمیں نواب شاہ عالم خاں کے ہاں عشائیے میں جانا تھا اور یہ عشائیہ عام طرح کا عشائیہ نہ تھا۔ بلکہ حیدر آباد دکن کی پرانی تہذیب کے رکھ رکھاؤ والا کھانا تھا۔ جسے "چوکی کھانا" کہا جاتا ہے۔ لفٹ میں بیٹھ کر اپنے کمروں کی طرف جاتے ہوئے بہت قریب سے "قیں قیں قیں" کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر لفٹ میں ادھر ادھر دیکھا کہ یہاں بطخ کہاں سے آ گئی ہے مگر یہ تو اپنے ضمیر جعفری تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو ان کا مخصوص سگنل تھا جو تھک جانے یا کسی بوریت سے دو چار ہونے کی صورت میں وہ کھتارسز کے لئے استعمال کرتے تھے یا بسا اوقات ایسی صورت حال میں کسی اجنبی سے سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے یکدم مضحک انداز اختیار کر لیتے تھے اور جان بوجھ کر انمل بے جوڑ جملے بولنے لگتے تھے۔ ضمیر صاحب کی یہ دلچسپ ادائیں ان کے علاوہ میری تھکن بھی اتار دیتی تھیں۔

ضمیر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مجھے اپنے کمرے میں چارپائی پر دراز ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ٹرن ٹرن ٹرن!

"میرے خیال میں مجھے "مچلا" بن جانا چاہئے اور ٹیلی فون نہیں اٹھانا چاہئے" میں نے سوچا۔

مگر گھنٹی مسلسل بجتی جا رہی تھی ——— ٹرن ٹرن ٹرن!

خوبصورت مہمان

ٹیلی فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی میرے جسم میں سارے دن کی تھکن سرایت کئے ہوئے تھی مگر پھر اس خیال سے کہ سفر میں ہیں اور ممکن ہے دوسری طرف کوئی مسافر نواز ہو۔ میں نے فون اٹھا لیا۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"صاحب! میں محمد نواز ڈرائیور بول رہا ہوں"

"ہت تیرے کی" میں نے اسے دل ہی دل میں کوستے ہوئے کہا "کیا بات ہے"

"صاحب! رویندر بھارتی میں اس وقت مائم شو ہے آپ کو لینے کے لئے آیا ہوں"

دوسری طرف سے "مسافر نواز" محمد نواز نے کہا۔

"تم چلو ہم نے آنا ہوا تو خود پہنچ جائیں گے" اور پھر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

"ٹرن ——— ٹرن ——— ٹرن" ٹیلی فون کی گھنٹی ایک دفعہ پھر بج رہی تھی۔

"میں ضمیر بول رہا ہوں۔ فوراً میرے کمرے میں چلے آؤ۔ کچھ خوبصورت مہمان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے "یاہو" کا نعرہ لگایا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر سیدھا باتھ روم میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا' منہ پر پانی کا چھنا مارا' بال سنوارے' کپڑوں پر کولون سپرے کیا اور دوسری منزل پر واقع ضمیر صاحب کے کمرے کا دروازہ "ناک" کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ستر سالہ ضمیر جعفری کے بستر پر ساٹھ ساٹھ سال کے دو بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"ان سے ملو' یہ مینائی صاحب ہیں' حیدر آباد دکن ہی کے ہیں اور یہ پاکستان کے ممتاز آئی سپیشلسٹ ڈاکٹر کرمانی ہیں"

اس وقت خود مجھے آنکھوں کے معائنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ مجھے دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" میں نے ان خوبصورت مہمانوں سے اندازے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

مگر کچھ ہی دیر کی گفتگو کے بعد ان واقعی خوبصورت مہمانوں سے جدا ہونے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر اس وقت رات کے آٹھ بجنے کو تھے اور بیگ احساس ہمیں نواب شاہ عالم خاں کے عشائیے میں لینے کے لئے ہمارے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

چمٹ کر سو گئی کل رات ان کے سینے سے

نواب شاہ عالم خاں کی پرانی طرز کی وسیع و عریض کوٹھی کے لان میں شہر بھر کی "ایلیٹ" جمع تھی۔ اپنی عمر سے بہت کم نظر آنے والے گورے چٹے نواب صاحب شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ نواب شاہ عالم خاں ایک سگریٹ ساز کمپنی کے مالک ہیں اور حیدر آباد دکن کی وضعدار تہذیب کے نمائندہ افراد میں سے ہیں۔ چنانچہ مشروبات کے بعد جب کھانے کے لئے ہم لان کے دوسرے حصے میں گئے تو یہ دیکھ کر بے پناہ فرحت ہوئی کہ لان میں چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان چاندنیوں کے درمیان میں چوکیاں رکھی تھیں جن پر کھانا دھرا جا رہا تھا۔ یہ حیدر آباد کے "چوکی کھانے" کا مخصوص انداز تھا۔ چنانچہ مہمان چار چار چھ چھ کی ٹولیوں میں ان چوکیوں کے گرد بیٹھ گئے۔ بریانی اور شیروانی حیدر آباد کے "قومی نشانات" میں سے ہیں اور اس دعوت میں بریانی اور شیروانی دونوں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ نواب صاحب کے گھر کی خواتین اور بعض دوسری مہمان خواتین بھی اس ضیافت میں شریک ہو گئیں۔ مگر وہ مردوں سے ذرا فاصلے پر علیحدہ چوکیوں کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں اور یوں یہاں بھی ایک اعتدال کی روش اپنائی گئی تھی۔ مجھے یہ "چوکی کھانا" اس قدر "ہانٹ" کر رہا تھا کہ میں کھانے سے زیادہ چوکیوں کے گرد "چوکی" ڈال کر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی تصویریں بنانے میں مشغول تھا۔ بیگ احساس نے مجھے کھانے سے غافل پایا تو انہوں نے کیمرہ مجھ سے لیا اور کہا "قاسمی بھائی آپ آرام سے کھانا کھائیں آپ کے لئے تصویریں میں بناتا ہوں"

کھانے کے بعد محفل شعر و سخن تھی اور یہ بھی فرشی نشست پر مشتمل تھی جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر نے مسند صدارت سنبھالی اور ایک بار پھر بہت مزا آیا کیونکہ یہ محفل شعر و سخن بھی بہت منفرد تھی۔ حیدر آباد والوں کے لئے نہیں کہ اس شہر کا تو اوڑھنا بچھونا ہی طنز و مزاح ہے۔ یہ انفرادیت ہم لوگوں کے لئے تھی کہ یہاں سب شاعر مزاحیہ کلام سنانے والے تھے۔ اور مزاحیہ کلام بھی کوئی ایسا ویسا نہیں بلکہ عام انداز سے بہت ہٹ کر مثلاً طالب خوندمیری کی نظم عام ڈگر سے بالکل ہٹ کر تھی۔ سید مصطفیٰ علی بیگ شاعر ہی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

نہیں۔ بڑے منجھے ہوئے کامیڈین بھی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی "اینگلو اردو غزل" سنائی اور کچھ اس طرح سے کہ ترنم بھی مزاحیہ تھا۔ حمایت اللہ کا قہقہہ اور کلام دکنی لہجے کی اردو میں تھا۔ ایک شاعر سید ساجد علی تھے جو بجنی تخلص کرتے ہیں انہوں نے ریختی سنائی۔ ریختی سنانے کی روایت تو یہ ہے کہ شاعر دوپٹہ اوڑھ کر اور دیگر زنانہ لوازمات کے ساتھ سامعین کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور عورتوں کی زبان اور زنانہ کیفیات کے حوالے سے شعر کہتا ہے مگر بجنی نے پینٹ اور قمیض پہنی ہوئی تھی گویا یہ ماڈرن بجنی تھی۔ بجنی کی ریختی کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔

یہ راز میں نہ سمجھ پائی آج تک بھالی
کہ تم سے آتی ہے کیوں بھائی جان کی خوشبو

چمٹ کے سو گئی کل رات ان کے سینے سے
بھلی کچھ ایسی لگی اسی جان کی خوشبو

سید مصطفیٰ علی بیگ نے جو "اینگلو اردو غزل" سنائی اس کا ایک شعر!

گدھا کہہ لیجئے آئی ڈونٹ مائنڈ
مگر ظاہر نہ ہو پائے ریلیشن

اس شعر پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ سید ضمیر جعفری نے یہاں جو نظم پڑھی وہ ان کے اپنے رنگ میں ہوتے ہوئے اپنے رنگ سے قدرے ہٹی ہوئی تھی۔ اس میں قہقہوں کے بجائے زیر لب مسکراہٹیں تھیں اور ایک فکری لہر بھی جو پوری نظم میں رواں دواں تھی سو مصطفیٰ علی بیگ کی "اینگلو اردو غزل" اور بجنی دہلوی کی "ریختی" کے درمیان اس نظم کا سواد کچھ اور ہی طرح کا تھا۔

ملاقاتیں ادھوری ہیں

کھانے اور محفل شعر و سخن سے فارغ ہو کر رات کو ساڑھے گیارہ بجے واپس ہوٹل

پہنچے تو ضمیر جعفری نے کار میں سے اترتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "اب تم سیدھے گھر جانا۔ ہاں! دیکھو لو کہہ دیا ہے اگر ادھر ادھر گئے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ بریانی کیسی لگتی ہے۔ شیروانی بھی کبھی پہنتے ہو کہ بس بریانی ہی کھاتے رہتے ہو؟" ڈرائیور بیچارا ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ مگر میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ کیونکہ گذشتہ چند دنوں کی رفاقت سے میں جان گیا تھا کہ ضمیر صاحب جب بہت بری طرح تھک جائیں اور یوں اکتاہٹ کا شکار ہوں تو یا تو وہ عجیب کی آوازیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں اور یا کسی اجنبی سے اس طرح کی بے ربط گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کا اور ساتھ میرا بھی "کتھارسز" ہو جاتا ہے۔ ضمیر صاحب اس وقت واقعی تھکے ہوئے تھے خود میں بھی تھکا ہوا تھا۔ مگر ضمیر صاحب کے اس "کتھارسز" سے میں اور وہ دونوں ایک دفعہ پھر تازہ دم ہو گئے تھے۔

میں اور ضمیر صاحب کاؤنٹر سے اپنے کمروں کی چابیاں لے کر لفٹ کی طرف جانے لگے تو لابی میں سامنے صوفوں پر غیاث متین بیٹھے نظر آئے ان کے ساتھ تین چار دوست اور بھی تھے اور یہ نجانے کب سے یہاں میرے اور ضمیر صاحب کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ضمیر صاحب کے چاہنے والے پاکستان کے علاوہ انڈیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور مزاح کے شہر حیدر آباد دکن میں تو ان کے مرید خصوصاً" بہت بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ غیاث متین کے ساتھ مضطر مجاز' رؤف خیر' قدیر زماں اور یوسف اعظمی تھے۔ مضطر مجاز بہت قادر الکلام اور پختہ فکر شاعر ہیں۔ اقبال کے بیشتر فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "موسم سنگ" کے نام سے ان کا طبع زاد کلام کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ رؤف خیر جواں ہی نہیں جواں فکر شاعر بھی ہیں۔ نئی حیثیت کی حامل اس شاعر کا مجموعہ "ایلاف" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ("ایلاف" کا مطلب پوچھا ان سے یاد نہیں رہا) قدیر زماں جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ اس کے علاوہ وہ ڈرامہ نگار اور مترجم ہیں۔ یوسف اعظمی شاعر نقاد اور دانشور ہیں۔ انگریزی ادب کے آدمی ہیں۔ اور باقاعدہ انٹیلکچول ہیں۔ ضمیر صاحب نے کچھ دیر ان دوستوں سے گپ شپ کی۔ وہ شاید کچھ دیر اور بیٹھتے مگر مجھے خدشہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد اگر ان

Optimized by www.ImageOptimizer.net

دوستوں کو اچانک کسی کونے سے بطخ کی آواز سنائی دی اور بطخ نظر نہ آئی تو یہ کہیں پریشان نہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ضمیر صاحب سے کہا کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آپ کمرے میں چل کر آرام کریں یہ سن کر ضمیر صاحب کی آنکھوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پھر وہ ان دوستوں سے ہاتھ ملا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں غیاث متین' قدیر زماں' رؤف خیر اور یوسف اعظمی رات کے دو بجے تک پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گپ شپ کرتے رہے اور جب اٹھے تو پتہ چلا کہ غیاث متین نے اس شہر میں مجھے تین اور دوست ایسے دیئے ہیں جن سے دوبارہ ملاقات اگر کبھی نہ بھی ہوئی تو بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔

تقریباً ڈھائی بجے بستر پر دراز ہوتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یاسر' عمر اور علی میرے ساتھ آکر لیٹ گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں "ابو ہمیں کہانی سناؤ" علی میرے پیٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ یاسر اور عمر میرے دائیں اور بائیں ہیں اور میں ان کے ننھے ننھے بازوؤں کے حلقے میں ہوں۔ اور پھر میں انہیں کہانی سناتے سناتے سو جاتا ہوں۔

صبح سات بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ضمیر صاحب ناشتے کے لئے بلا رہے ہیں۔ میں ضمیر صاحب اور حسن عسکری ناشتے کے لئے نیچے ریستوران میں پہنچتے ہیں۔

جنوبی ہند کا خاص ناشتہ

"جنوبی ہند میں ہیں تو آج ناشتہ بھی خالص جنوبی ہند کا کرنا چاہئے" حسن عسکری کہتے ہیں۔

"اور اس کے بعد کانٹینینٹل ناشتہ" ضمیر صاحب لقمہ دیتے ہیں۔

"ویٹر" (حسن عسکری)

"ویٹر" (ضمیر جعفری)

"ویٹر" (عطاء الحق قاسمی)

ہم تینوں باری باری ویٹر کو آوازیں دیتے ہیں۔ مگر ویٹر تو وہ ہوتا ہے جس کے لئے

آپ کو "ویٹ" کرنا پڑے چنانچہ تھوڑی دیر "ویٹ" کرانے کے بعد بالآخر ویٹر آتا ہے "اگر آپ نے ساؤتھ انڈین ناشتہ کرنا ہے۔ تو ہوٹل کے ویجیٹیرین جائیں یہاں صرف نان ویجیٹیرین ناشتہ ملتا ہے"

ویجیٹیرین ریستوران میں ہم دوسہ منگواتے ہیں۔ یہ چاول کو پیس کر چپاتی سے بھی پتلا بنایا جاتا ہے اور پھر اسے رول کر کے اس میں سبزی بھری جاتی ہے۔ مزیدار چیز ہے۔

"اب کوئی سویٹ ڈش بھی ہونی چاہئے" ضمیر صاحب کہتے ہیں۔

اور پھر غالباً "ہم پنگل" کا آرڈر دیتے ہیں جو چاول' دالوں' دودھ' چینی' کاجو' اور پتے کے "اجزائے ترکیبی" پر مشتمل ہے۔

"کیسا ہے؟" میں ضمیر صاحب سے پوچھتا ہوں۔

"اچھا ہے" ضمیر صاحب کہتے ہیں "مگر پینھا پینھا ہی ہے"

تھوڑی دیر بعد رائل ٹاکیز سلطانہ بازار میں مزاحیہ فلم فیسٹیول کا افتتاح بھارت کے مرکزی وزیر اطلاعات وی این گاڈگل نے کرنا ہے۔ مگر میرا ارادہ نوائے وقت کے لئے رامارا ؤ سے انٹرویو کرنے کا ہے چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران ان سے رابطے کی کوشش کی جائے۔ البتہ ڈھائی بجے "اردو مزاح" کے موضوع پر سیمینار ہے۔ شام کو ساڑھے چھ بجے اردو کے مزاحیہ مضامین کا سیشن ہے (جس میں ہم نے "کام" دکھانا ہے) اور رات کو پنجابی سیشن ہے جس میں شرکت بھی ہم نے بہرحال کرنی ہے۔ ان کے علاوہ بنگالی' گجراتی' کنڑی' ملیالم' مرہٹی' تلگو اور تامل زبانوں میں مزاح کے موضوع پر متوازی سیمینار بھی ہو رہے ہیں۔ چنانچہ میں ضمیر صاحب سے مشورہ کرتا ہوں وہ میرے ساتھ اتفاق کرتے ہیں اور پھر ہم یہاں سے اٹھ کر واپس کمرے میں آجاتے ہیں۔

"میں کمرہ نمبر 106 سے بول رہا ہوں"

"بولو" آپریٹر کہتا ہے۔

"رامارا ؤ صاحب کے سیکرٹری کا فون نمبر چاہئے اور اگر مل جائے تو ان سے بات بھی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کراویں"

"بہت اچھا صاحب"

"تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجتی ہے" یہ لو صاحب شری راماراؤ سے بات کرو!"

ایک پرانا شہر اور دوسرا کم پرانا شہر

"ہیں! دوسری طرف راماراؤ خود ہیں میں یہ سوچ کر تھوڑی دیر کے لئے ایکسائٹڈ ہوا، مگر مجھے آپریٹر کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں پاکستان سے آیا ہوں اور ——"

مگر دوسری طرف میری بات کاٹ دی گئی "جی مجھے یہ آپ کے سیکرٹری نے بتایا ہے" دوسری طرف سے بولنے والے نے آپریٹر کو سیکرٹری قرار دیتے ہوئے کہا "مگر شری راماراؤ اپنی انتخابی مہم پر حیدر آباد سے باہر ہیں اور ان کی واپسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا"

اب میں نے سوچا کہ حکومتی پارٹی (تیلگم دیش) کے سیکرٹری جنرل مسٹر اوپندرے جو در حقیقت اس پارٹی کے فکری رہنما ہیں وقت لیا جائے اس میں کامیابی ہوئی چنانچہ ان سے اگلے روز صبح دس بجے کا وقت طے ہوا مگر وقت مقررہ پر وہ اپنے بتائے ہوئے ٹیلی فون نمبروں میں سے کسی پر بھی دستیاب نہیں ہوئے۔ پھر میں نے موجودہ "نظام دکن" (حرف نسلی طور پر) سے انٹرویو کی کوشش کی پتہ چلا کہ موصوف ملک سے باہر رہتے ہیں بھارت کے تہلکہ مچادینے والے کرکٹر اظہر الدین کو ملنے کا اردہ کیا مگر اس دوران روزنامہ "سیاست" کی ایک خبر پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ اس کے مکان پر شائقین چوبیس گھنٹے ہلہ بولے رکھتے ہیں جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا اور میں نے دل میں مان لیا کہ کوئی اخباری "سکوپ" میرے مقدر میں نہیں تو میں نے حیدر آبادی دوستوں کی طرف سے دی گئی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی ضمیر صاحب اس دوران بستر پر دراز ہو چکے تھے اور انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں غالباً" نیم خوابیدگی کے عالم میں تھے دوستوں کی عطا کردہ کتابوں کے ڈھیر میں

سے جو کتاب "قراعد اندازی" میں میرے ہاتھ لگی وہ محمد برہان حسین کی تھی اور اس کا نام "چند کلیاں نشاط کی" تھا۔ محمد برہان حسین "رہنمائے دکن" سے وابستہ ہیں ان کے ایک مضمون "اور آنا لندن سے ماہر ٹریفک کا" نے بہت مزا دیا اس کا ایک حصہ تو آپ بھی سنیں۔

"اس نے کہا ویل مسٹر! آپ کا شہر کا دو حصہ ہے ندی کے دو طرف۔ ایک پرانا شہر دوسرا کم پرانا شہر"

ہم اس "کم پرانے" کی جدت پر اچھل پڑے۔ ہم نے کہا آپ کا مطلب پرانا اور نیا شہر ہے!

وہ بولا نو نو، ہم اس کو نیا نہیں کہہ سکتا۔ آپ کے پرانے شہر کی ٹریفک قابل دید ہے اور کم پرانے شہر کی ٹریفک کم قابل دید!

ہم نے کہا ارے یار تم تو الفاظ کا استعمال اس قدر احتیاط سے کر رہے ہو جیسے وصیت لکھا رہے ہو۔

اس نے کہا بھئی ایک بات تو بتاؤ یہ سنجے گاندھی کو فیملی پلاننگ کی کیا سوجھی۔ وہ یہ مسئلہ تو یہاں کی ٹریفک پر چھوڑ سکتا تھا بہرحال میں ٹریفک کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کرتا ہوں پہلی تجویز یہ ہے کہ آپ شہر کو ڈبل سٹوری بنا دیجئے۔ آپ دکانیں، سیمینار، ریلیں، زمین کے نیچے کر دیجئے اور سڑکیں اوپر۔

ہم نے کہا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں سیمنٹ اصلی نہیں ملتا اور نقلی سیمنٹ میں کنٹریکٹر کم ڈالتا ہے نتیجہ یہ ہو گا کہ زمین کے نیچے جو بھی جائے گا وہ اوپر کبھی نہیں آئے گا۔

وہ بولا او کے آپ رکشے بند کر دیجئے کیونکہ یہ سڑک کے بڑے حصے کو بڑی دیر تک گھیرے رکھتے ہیں!

ہم نے کہا یہ بھی نہیں ہو سکتا اس شہر میں ہر گھنٹہ میں ایک درجن بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے آدھے رکشے چلاتے اور آدھے اس پر سواری کرتے ہیں۔

اس نے کہا آؤ! تو آپ کم از کم سائیکلیں بند کر دیجئے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ہم نے کہا ارے بھائی سائیکلیں بند ہوئیں تو یہاں تلنگانہ ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گا۔

وہ بولا اچھا تو پھر آپ سپیڈ بریکر ختم کر دیجئے۔ اس سے ٹریفک کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے کہا ہر سپیڈ بریکر ایک میموریل ہے۔

میموریل؟ کاہے کا؟

ارے صاحب جس طرح انگریز لوگ جنگ میں مرنے والوں کے میموریل بناتے ہیں نا' اسی طرح یہاں ٹریفک کے حادثہ میں جب کوئی مرتا ہے تو میونسپل کارپوریشن والے اس کی یاد میں سپیڈ بریکر بنا دیتے ہیں۔

وہ غصہ سے بولا پھر یہاں کی ٹریفک پولیس کیا کرتی ہے ہم نے کہا وہ صرف پرسنل ٹیکس وصول کرتی ہے۔

اس نے پوچھا پرسنل ٹیکس کسے کہتے ہیں؟

وہ رقم جو سرکاری خزانے میں داخل نہیں کی جاتی۔

اس نے کہا واہ اگر میرا کوئی مشورہ قبول نہیں کرنا تھا تو پھر مجھے اس گرم ملک میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہم نے کہا صرف اسی لئے کہ ہماری ٹریفک پولیس کے سالانہ بجٹ میں رقم بچ گئی تھی اور سال ختم ہو رہا تھا اب آئندہ سال اسی بجٹ میں میں تم سے انہی مسائل پر مشورہ کرنے لندن آؤں گا گڈ بائی خوش رہو اور ویٹ کرو!

وہ بولا او کے ضرور آؤ' مگر واپس ضرور جانا!

اس دوران ضمیر صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے میں نے انہیں اس مضمون کے مندرجہ حصے سنائے سن کر کہنے لگے اس میں "پرانا شہر اور کم پرانا شہر" والی بات خصوصاً بہت خوب ہے۔

میں نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں اور مجھے تو اس فقرے نے ایک اور حوالے سے بھی مزا دیا ہے"

پوچھنے لگے وہ کیا۔

میں نے کہا "شہروں کے سلسلے میں تو یہ بات اگر دیکھا جائے تو بسا اوقات تفنن طبع کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مگر شاعری کے سلسلے میں یہ بات سو فیصد درست ہے"

بولے "وہ کس طرح؟"

میں نے کہا "وہ اس طرح کہ نئی شاعری اور پرانی شاعری کوئی چیز نہیں بلکہ اس کی جگہ پرانی شاعری اور کم پرانی شاعری کے الفاظ زیادہ موزوں ہیں کیونکہ جسے ہم نئی شاعری کہتے ہیں وہ بھی دراصل پرانی شاعری کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ویسے میری اس بات کو ٹی۔ ایس ایلیٹ نے ذرا مشکل لفظوں میں بیان کیا ہے اور یوں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میری بات پرانی اور ٹی ایس ایلیٹ کی کم پرانی ہے!

Optimized by www.ImageOptimizer.net

یک نہ شد دو شد:

اتنے میں دروازے پر "ٹاک" ہوا اور پھر مسیح انجم' بیگ احساس اور ذہانت بیگ ہمارے سامنے کھڑے تھے تھوڑی دیر بعد مجتبیٰ حسین بھی آ گئے۔ مجتبیٰ حسین دوران گفتگو بھی پھلجڑیاں چھوڑتے ہیں اور پھر یہاں تو پیرو مرشد ضمیر صاحب بھی موجود تھے گویا یک نہ شد دو شد! مجتبیٰ حسین نے ایک دلچسپ بات سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا انہوں نے بتایا کہ وہ گذشتہ دنوں لندن گئے تو ایک محفل میں ان کی ملاقات ایک معروف صحافی کے ساتھ خالصتان موومنٹ کے لیڈر ایک سردار جی بیٹھے تھے یہ سردار جی کہہ رہے تھے کہ خالصتان بن کر رہے گا اور پھر ہم خالصتان اور پاکستان کو ملا کر ایک ملک بنا دیں گے یہ سن کر صحافی نے کہا "سردار جی آپ اس ملک کا نام کیا رکھیں گے؟ سردار جی نے برجستہ کہا "خالص پاکستان"

اردو ہال میں اردو طنز و مزاح پر سمپوزیم کا وقت قریب تھا اور یہ دوست اب چلنے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم جلدی جلدی تیار ہو کر دروازے کی طرف جانے لگے تو فون کی گھنٹی بجی میں دروازے سے لوٹا۔ دوسری طرف ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو تھیں۔ ارے میں تو اس ساری گہما گہمی میں بھول ہی گیا تھا کہ ہم جیلانی بانو کے شہر میں ہیں انہوں نے ہمیں پرسوں رات کے کھانے پر بلایا تھا اسی روز جناب عابد علی خان کے ہاں ہم لنچ پر مدعو تھے میں ٹیلی فون سن کر واپس جانے لگا تو محمد حسن عسکری کا فون آیا کہ حسن الدین احمد صاحب نے ہم پاکستانی مہمانوں کو اگلے روز عشائیے پر مدعو کیا ہے لہٰذا ہم اس ضمن میں کسی سے وعدہ نہ کریں اس کے ساتھ ہی حسن الدین احمد صاحب کا فون بھی آیا اور ان کی نرم گفتاری کا مزا ٹیلی فون پر ہی آ گیا میں ایک دفعہ پھر دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس دفعہ دوسری طرف سردار گھبیر سنگھ تھے جو حیدر آباد کے ممتاز صنعت کار ہیں اور پنجابی تنظیم کے کنوینئر ہیں انہوں نے اصرار کیا کہ آج رات کو اردو سیشن سے جلدی اٹھ کر ضمیر صاحب اور آپ ہمارے پنجابی سیشن میں آئیں گے اس کے بعد آپ کے اعزاز میں نظام کلب میں عشائیہ ہے دروازے تک پہنچتے پہنچتے ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج رہی تھی مگر اس بار مجتبیٰ حسین

نے میرا بازو پکڑا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

رشید احمد صدیقی "آورد" اور پطرس "آمد" کے بانی ہیں

ہم حمایت نگر میں واقع اردو ہال میں داخل ہوئے تو تقریباً پانچ سو لوگ خشک مقالے سننے کے لئے تیار بیٹھے تھے گویا حیدر آباد والے سنجیدہ ہونا بھی جانتے ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس محفل کی صدارت کے لئے غالباً" آج ہی دہلی سے حیدر آباد پہنچے تھے۔ جناب حسن عسکری کو یہاں مہمان خصوصی بنایا گیا اور ہمیں ڈائس پر ان کے ساتھ بٹھا دیا گیا عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے روح رواں نریندر لوتھر اس اجلاس میں بھی موجود تھے وہ پتہ نہیں کتنے متوازی اجلاسوں کو بھگتا کر یہاں پہنچے تھے مجھے شک گزرا کہ اس شخص کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں ایک مقالہ پروفیسر سلیمان اطہر نے اردو کی مزاحیہ نظم کے حوالے سے پڑھا اور یہ خاصا پروفیسروں والا مقالہ تھا دوسرا طویل مقالہ جناب ظ۔ انصاری کا تھا اگرچہ بعد میں بحث کے دوران ایک شریک محفل نے کہا کہ اس مقالے کے صرف وہی حصے اچھے تھے جو مزاح نگاروں کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل تھے مگر میرے نزدیک غالباً" ایسا نہیں تھا پورا مقالہ اچھا تھا البتہ ظ۔ انصاری نے گھپلا یہ کیا کہ اپنے پسندیدہ مزاح نگاروں کی خوب تحسین کر کے اور معاشرے کے تضادات پر ان کی طنز اجاگر کر کے آخر میں یہ کہا کہ ان کے ہاں "کومٹ منٹ" کی کمی ہے جس کے باعث ان کے فن میں کچھ کسر رہ گئی ہے مقالے میں موجود اس تضاد پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے خوب لتے لئے ہم نے آج تک ڈاکٹر صاحب کی صرف شیریں بیانی دیکھی تھی اس روز ہم نے شیرینی اور تلخی کی "کاک ٹیل" بھی چکھی۔ ویسے اس محفل میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو کے دو بڑے ادیبوں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے حوالے سے ایک کمال کی بات کہی جو "کوٹیشن" کے زمرے میں آتی ہے انہوں نے کہا رشید احمد صدیقی اردو مزاح میں "آورد" اور پطرس "آمد" کے سکولوں کے بانی ہیں!

اس محفل میں سید ضمیر جعفری نے بھی مختصر سا خطاب کیا اور اس خوبصورت محفل کے انعقاد پر منتظمین کو مبارک باد دی ان کے علاوہ سامعین میں سے یوسف ناظم' حامد حسین'

Optimized by www.ImageOptimizer.net

عزیز قیسی' عاتشقان اور ڈاکٹر انور معظم نے یہاں پڑھے جانے والے مقالوں کے حوالے سے مختلف سوالات اٹھائے۔ ایک ہندو مزاح نگار وی وی پدمنا محض یہ کہنے کے لئے سٹیج پر آئے کہ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دینے والوں کے دعوے بے بنیاد ہیں سامعین نے پر جوش تالیاں بجا کر ان کی تائید کی اور اب مہمانوں پر مشتمل یہ قافلہ لنچ کے لئے ایک "نامعلوم" منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

لاحول ولا قوۃ

لنچ کے بعد اب قیلولہ کے لئے ہوٹل واپس جانا ضروری ہو گیا تھا۔ جو قارئین قیلولہ کے بارے میں نہیں جانتے' ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ قیلولہ بس قیلولہ ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شرفاء کرسی پر بیٹھے بیٹھے قیلولہ کر لیتے ہیں' جبکہ بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا چارپائی پر منگواتے ہیں "گھوڑے بیچ کر سونا" جیسے محاورے اس قسم کے قیلولہ ہی کے حوالے سے ایجاد ہوئے ہیں۔ لفظ قیلولہ اگرچہ مشکل ہے مگر چیز اچھی ہے اور میرا جی اس وقت اسی چیز کو چاہ رہا تھا! مگر ہوٹل میں تلگو زبان کے روزنامہ "اندھرا پربھا" کے پی این سوامی میرے منتظر تھے۔ اس روز میں نے قیلولہ انہیں انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔ اگلے روز ہوٹل میں میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے ملازمین اس روز پہلے سے زیادہ ادب و احترام کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسا کہ قارئین جانتے ہیں راقم کو نام و نمود سے کوئی غرض نہیں' چنانچہ سوامی جی اگلے روز اخبار کے جو دو پرچے میرے ریکارڈ کے لئے دے گئے تھے' ان میں سے ایک میں نے سنبھال لیا اور دوسرا محض یہ جاننے کے لئے کہ اس میں کیا لکھا ہے' اپنی بغل میں داب کر ہوٹل کی لابی میں ادھر ادھر گھومتا رہا مثلاً مسز پردھان کو میں نے وہ اخبار دکھایا اور کہا میں تلگو نہیں جانتا' مگر چونکہ اس کے ساتھ میری بڑی ساری تصویر (یہ دیکھیں) چھپی ہوئی ہے' لہٰذا لگتا ہے کہ اخبار نے کچھ میرے بارے ہی میں لکھا ہے' بلکہ میں نے بلغاریہ کی مس گیلنا کو ریسپشن سے اپنے کمرے کی چابیاں وصول کرتے دیکھا تو احتیاطاً اس سے بھی پوچھ لیا کہ بی بی ذرا دیکھو تو اخبار میں کیا چھپا ہے اس فتالہ نے ایک نظر اخبار پر ڈالی اور کہا "اوہ! آپ تصویر

میں تو خوبصورت لگتے ہیں (لاحول ولا قوۃ!)

عطاء الحق خاسمی

پی این سوامی کے جانے کے بعد ابھی میں "باقاعدہ" قیلولہ کے لئے تیاریاں پکڑ ہی رہا تھا کہ روزنامہ "سیاست" کے نوجوان اور دلکش شخصیت کے حامل ذہانت بیگ آ گئے۔ انہوں نے اپنے اخبار کے لئے مجھ سے اردو ادب اور خصوصاً "طنز و مزاح" کے حوالے سے گفتگو شروع کر دی۔ میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہر جائیں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دوں گا۔ پہلے آپ میرے دو سوالوں کے جواب دیں"

کہنے لگے "فرمائیں!"

میں نے کہا "پہلی بات یہ ہے کہ یہ حیدر آباد دکن والے مجھے "قاسمی صاحب" کی بجائے "خاسمی صاحب" کیوں کہتے ہیں؟"

ہنس کر کہنے لگے "آپ بھی تو خود کو قاسمی" کی بجائے کاسمی" کہتے ہیں' اصل میں حیدر آبادیوں اور پنجابیوں دونوں کا "قاف" درست نہیں ہے۔ چنانچہ حیدر آباد میں تو جتنے دن بھی آپ رہیں گے' آپ کو عطاء الحق خاسمی" ہی بن کر رہنا پڑے گا!"

یہ عزیز ٹھیک کہتا تھا' چنانچہ میں نے حیدر آباد دکن میں ایک ہفتہ "عطاء الحق قاسمی" کی بجائے "عطاء الحق خاسمی" کے طور پر گزارا۔ مجھے اپنے نام کے سلسلے میں امریکہ اور یورپ میں بھی اسی قسم کے پرابلم کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے' چنانچہ جدھر سے گزرتا تھا "قاسمی" کی بجائے "کس می' کس می" کی آوازیں آتی تھیں۔ ذہانت بیگ سے گفتگو کے دوران ایک دلچسپ صورت حال ذہن میں آئی اور وہ یہ کہ دنیا بھر میں زبان کا یہ مسئلہ موجود ہے۔ مثلاً ہندی والے غ کو گ اور ز کو ج بولتے ہیں چنانچہ وہاں "غالب کی غزلیں" نہیں "گالب کی گجلیں" گائی جاتی ہیں۔ مصری لوگ ج ادا نہیں کر سکتے' وہ اس کی جگہ گ کی آواز نکالتے ہیں چنانچہ وہ "جمال عبدالناصر" کو گمال عبدالناصر" کہتے ہیں۔ اسی طرح ترکی میں ک کی جگہ چ کی آواز نکالی جاتی ہے چنانچہ وہ "اتاترک" کو اتاترچ" کہتے ہیں بلکہ میں استنبول کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

لئے گیا تو وہاں امام صاحب نے جب "انا اعطینا چل چوڑ" اور "اللہ اچبر" کہا' تو نماز کے دوران بھی مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی۔ یہ باتیں سوچ کر مجھے اتنا اطمینان ہوا کہ جب اگلے روز ایک تقریب میں سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ "خواتین و حضرات! یہ "تخریب" سید ضمیر جعفری اور "عطاء الحق خاسی" کے اعزاز میں "منعخد" ہو رہی ہے تو دل کو کچھ صبر سا آگیا!

مجنوں نظر آتی ہے ——

"دوسرا سوال؟" ذہانت بیگ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "دوسرا سوال یہ کہ حیدر آباد میں نسوانی نام کچھ مردانہ سے ہیں' مثلاً اشرف رفیع ہیں' ہماری بھابھی رشید موسوی ہیں' ڈاکٹر جعفر ہیں' بشیر قربان علی ہیں' رفیع رؤف ہیں' کیا خیال ہے مردوں کو "جواب آن غزل" کے طور پر نسوانی نام نہیں رکھنے چاہئیں؟"

مگر پھر مجھے خود ہی خیال آیا کہ حیدر آباد والوں کے ناموں کا جواب ہمارے پنجاب کے مرد پہلے ہی سے دے رہے ہیں' مثلاً ہمارے ہاں نوجوان شاعر ناہید شاہد ہیں' جن کے پاس کتنے ہی مدیران رسائل کے "عاشقانہ خطوط جمع ہیں' بزرگ شاعر زیبا ناروی ہیں' جن کی وجہ سے گوجرانوالہ میں ایک مشاعرہ الٹ گیا تھا' اہالیان گوجرانوالہ سمجھے کہ شاید کوئی حسینہ زیبا آرہی ہیں' چنانچہ وہ زیبا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جوق در جوق مشاعرہ گاہ میں پہنچے وہاں جب زیبا ناروی کے نام کا اعلان ہوا تو لوگ جگر تھام کر بیٹھ گئے اور جب حضرت زیبا ناروی اپنی سیاہ رنگت اور سفید لمبی داڑھی کے ساتھ مائک پر آئے تو ہنگامہ ہو گیا۔ اسی طرح کشور ناہید شاعرہ ہیں اور کشور مراد کشور نام کے ایک شاعر بھی موجود ہیں۔ ایک اداکارہ شمیم آراء ہیں اور ایک شمیم میرا دوست ہے۔ اداکارہ روحی بانو ظاہر ہے خاتون ہیں جبکہ روحی کنجاہی ماشاء اللہ مرد ہیں! ایک سرفراز اقبال صاحبہ ہیں' ایک سرفراز شاہد ہیں جو مزاحیہ شاعر ہیں غرض یہ کہ یہ فہرست کافی طویل ہے چنانچہ میں نے دوسرا سوال بھی از خود رضاکارانہ طور پر واپس لے لیا!

اس "مرحلے" سے فارغ ہونے کے بعد کافی دیر تک اردو کے مزاحیہ ادب کے حوالے سے ذہانت بیگ کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ دوران گفتگو ایک مرحلے پر مجھے بہت

شرمندگی محسوس ہوئی۔ اور یہ مرحلہ وہ تھا جب ذہانت بیگ نے بھارت میں لکھے جانے والے مزاحیہ ادب کے حوالے سے ایک سوال کیا۔ یہ عجیب صورت حال ہے کہ پاکستان کا قاری رشید احمد صدیقی' فکر تونسوی اور کنہیالال کپور کے نام اور کام سے تو واقف ہے' مگر ان کے بعد اس کی معلومات صفر ہیں' جبکہ اس وقت بھارت میں جن مزاح نگاروں کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے' ان میں احمد جمال پاشا' یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین بطور خاص بہت اہم ہیں۔ بزرگ مزاح نگار احمد جمال پاشا کے کچھ قارئین تو پاکستان میں موجود ہیں۔ لیکن میں نے ان میں سے صرف مجتبیٰ حسین کو پڑھا ہے کیونکہ ان کی کتابیں دستیاب ہو گئی تھیں' باقیوں کے صرف نام سے واقف ہوں' کام کی خبر نہیں ہے۔ صرف حیدر آباد شہر میں مزاح نگاروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے مگر ان کی رسائی تاحال پاکستان کے جینوئن قاری تک بھی نہیں ہو سکی!

رضاکار تو اس شہر میں بہت تھے!

ذہانت بیگ ادھر سے فارغ ہو کر اب ضمیر جعفری صاحب کے کمرے میں چلے گئے تھے' میں نے اس دوران کپڑے تبدیل کئے اور بستر میں دراز ہو گیا' مگر تھوڑی دیر بعد لانڈری والا لڑکا کپڑے لے کر آگیا' یہ وہی نوجوان تھا جس سے پہلے روز میں نے پوچھا تھا کہ ہوٹل میں "استری" کا بندوبست ہو سکتا ہے' تو وہ مائنڈ کر گیا تھا' مگر اب وہ میرے کپڑے استری کروا کر لایا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میری طرح غالباً" اس نے بھی اس روز لفظ "استری" سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو بعد میں "انجائے" کیا تھا تھوڑی دیر بعد بیگ احساس آگئے مجھے یہ نوجوان بہت اچھا لگتا ہے' بلکہ مجھے تو یہ چھوٹے بھائی کی طرح محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ حیدر آباد میں ہے' میں لاہور میں ہوں' شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں' مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے' مگر شاید فرق پڑتا ہے' اس کی ایک بہن پاکستان میں تھی' اور وہ بھائی کو دیکھے بغیر مر گئی ہے۔ گھنگھریالے بالوں والا "بے بی گلیکسو" جیسا بیگ احساس اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور "معاصر" کی ورق گردانی کر رہا ہے!

"یار یہ ایک ہی پرچہ رہ گیا ہے' میں نے سوچا تھا جامعہ عثمانیہ کی لائبریری کو دے دوں

گا مگر یہ آپ رکھ لیں، جامعہ کو پرچہ پھر بھجوادوں گا!"

"نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کا حق فائق ہے" بیگ احساس کہتے ہیں "میں یہ پرچہ لے جاتا ہوں مگر پڑھنے کے بعد آپ کو لوٹادوں گا تاکہ آپ جامعہ کو ڈونیٹ کر سکیں!"

پھر ہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں، اپنے بارے میں، اپنے عزیزوں کے بارے میں اپنے جذبوں کے بارے میں! اتنے میں ضمیر جعفری "نہائے دھوئے" کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اس بزرگ کا پرانا نیاز مند ہوں، مگر اس سے قبل میں ان کا احترام ان کی خوبصورت شاعری، کی وجہ سے کرتا تھا، مگر وہ جس طرح ہر شخص سے "محبت" سے ملتے تھے، ان کے بارے میں اندر ہی اندر میری رائے یہ تھی کہ ان کی یہ محبت "آمد" ہی نہیں "آورد" کی ذیل میں بھی آتی ہے لیکن سفر میں ان کے ساتھ جو دن گذرے پتہ چلا کہ ان کے آباؤ اجداد ہی نہیں یہ خود بھی صوفی ہیں، ان کے دل میں لوگوں کے لئے محبت ہی محبت ہے اور یہ کسی کے بارے میں برا سوچنے کے "اہل" ہی نہیں ہیں۔

ضمیر صاحب اپنی ایک کتاب بیگ احساس کو لکھ کر پیش کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں لکھنے میں دشواری پیش آرہی ہے کیونکہ ان کی عینک سفر کے دوران گم ہو گئی تھی۔ بیگ احساس کہتے ہیں آپ کے پاس حسن عسکری صاحب کی عینک ہے، وہ کیوں نہیں لگا لیتے اس پر ضمیر صاحب جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں "پہلے چشمے کے بغیر دشواری ہو رہی تھی، اب چشمہ لگانا یاد نہیں رہتا!"

میں بیگ احساس سے کہتا ہوں "یار میں خط و کتابت اور کتابیں وغیرہ بھیجنے کے معاملے میں بہت سست ہوں اگر مجھے کوئی رضا کار مل جائے جو بنڈل بنا کر پوسٹ کر دیا کرے تو میں آپ کو اکثر کتابیں وغیرہ بھیجتا رہوں۔"

ضمیر صاحب یہ سن کر کہتے ہیں "رضا کار تو اس شہر میں بہت تھے، مگر وہ سب کے سب کام آگئے۔"

الہ دین کے جن کا زوال

اب ہم رویندر بھارتی کے لئے "رخت سفر" باندھ رہے ہیں، جہاں اس وقت عالمی مزاح کانفرنس کا ایک لحاظ سے مرکزی سیشن ہے کیونکہ یہاں تخلیقی مزاحیہ مضامین پڑھے جاتے ہیں اور سچ پوچھیں تو اس کانفرنس میں بنیادی طور پر ہم ہی سیشن کے لئے بلائے گئے ہیں کیونکہ اسی کانفرنس کو پھیلایا تو صرف اس دفعہ گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا دائرہ کار اردو کے نثری اور شعری مزاحیہ ادب تک محدود تھا! یہاں صدارت سید ضمیر جعفری کی ہے، لیکن لگتا ہے ہم خاصے لیٹ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ شام ڈھلے کافی دیر گزر چکی ہے۔ ہماری کار بوڑھے اور مریل سائیکل رکشہ چلانے والوں کے ہجوم میں سے رستہ بناتی ہوئی رویندر بھارتی پہنچتی ہے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ جلسہ کب کا شروع ہو چکا ہے، ہال لوگوں سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ میں انہیں چٹ بھیجتا ہوں کہ مجھے اور فکر تونسوی کو جلد فارغ کر دیا جائے، کیونکہ پنجاب سیشن والے ہمیں لینے کے لئے یہاں پہنچے ہوئے ہیں، جن کا متوازی اجلاس اس وقت ایک اور جگہ پر منعقد ہو رہا ہے۔ ضمیر صاحب صدارت کر کے وہاں پہنچیں گے! یہاں سید ضمیر جعفری، فکر تونسوی یوسف ناظم، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین ڈاکٹر حبیب ضیاء شفیقہ فرحت، پرویز اللہ مہدی جہاں قدر چغتائی رشید قریشی اور مسیح انجم اپنے قہقہہ اور مضامین سناتے ہیں۔ ایک مضمون میں بھی سناتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ حیدر آباد والے مجھ جیسے مبتدی کی بھی کتنی حوصلہ افزائی کرتے ہیں مضمون کا عنوان "الہ دین کے جن کا زوال" تھا اور شاید اس کی داد اہل حیدر آباد ہی دے سکتے تھے جو سقوط حیدر آباد کے سانحہ سے گذرے تھے۔

پنجابیوں کے درمیان

اب فکر تونسوی اور میں پبلک گارڈن کے اندر اپریہ درشنی ہال میں ہیں جہاں پنجابی سبھا حیدر آباد کے زیر اہتمام عالمی مزاح کانفرنس کے سلسلے میں نثر نظم اور سنیچ کامیڈی پر مشتمل ایک ملا جلا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔ پنجابی سبھا کے صدر سردار گھمبیر سنگھ محفل کو

Optimized by www.ImageOptimizer.net

نسٹربینس سے بچانے کے لئے اسٹیج پر گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ادھر سے ادھر جاتے ہیں جبکہ انہوں نے پتلون بیلٹ کے بغیر پہنی ہوئی ہے یہاں فکر تونسوی اور میرے علاوہ سردار دلیپ سنگھ سردار تارا سنگھ کامل اور مسٹر اینڈ مسز سپروال اپنے اپنے "آئیٹم" پیش کرتے ہیں صدارت سردار عجب سنگھ کی ہے اور مہمان خصوصی ایڈیٹر "ملاپ" یدھ ویر ہیں۔ محفل اختتام کو پہنچنے ہی کو ہے کہ منتظمین اور سامعین کے چہرے اچانک کھل اٹھتے ہیں۔ سید ضمیر جعفری اور نریندر لوتھر اردو سیشن سے فارغ ہو کر سٹیج کی طرف آ رہے ہیں۔

ٹوہوم اٹ مے کنسرن

سید ضمیر جعفری اور نریندر لوتھر کے پہنچنے سے محفل میں رونق سی آگئی نریندر لوتھر نے یہاں جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ کوٹیشن کی ذیل میں آتا ہے۔ اس جملے میں وہ ظرافت اور طنز موجود تھی' جو اس طرح کے جملے کے جملہ حقوق محفوظ نہیں رہنے دیتی اور یوں یہ جملہ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ اور نریندر لوتھر کا وہ جملہ کچھ یوں تھا کہ "خواتین و حضرات! پنجابی میری مادری زبان ہے۔ چنانچہ یہ زبان میری ماں کو آتی ہے' مجھے نہیں!" نریندر لوتھر نے یہاں ایک اور مزیدار بات کہی اور وہ یہ کہ "اس وقت چھ زبانوں کے متوازی اجلاس ہو رہے ہیں میں کبھی ادھر جاتا ہوں کبھی ادھر جاتا ہوں چنانچہ ساری زبانیں بھول گیا ہوں۔" پنجابی پرہیا کے اجلاس میں مزا مجھے اسٹیج سیکرٹری تارا سنگھ کامل کے ان تعارفی کلمات نے بھی دیا' جو انہوں نے میرے بارے میں ادا کئے یہ بزرگ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' چنانچہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نظم کہتا ہوں کہ نثر لکھتا ہوں' سنجیدہ لکھتا ہوں یا طنز و مزاح کو ذریعہ اظہار بناتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اسٹیج پر بلانے کے لئے جو "محفوظ" اناونسمنٹ کی وہ اس طرح کی تھی "بہنو تے بھراؤ! اب جو شخصیت آپ کے سامنے آ رہی ہے' اس کے بارے میں مجھے آپ کو کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں' یہ پاکستان اور ہندوستان کی مٹی تنی شخصیت ہیں میں ان کے بارے میں کچھ بتلانا اچھا نہیں لگتا' چنانچہ جب یہ مائک پر آئیں گے تو آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ یہ کیا چیز ہیں۔ اب میں قاسمی صاحب اور آپ کے درمیان حائل نہیں ہونا

چاہتا' چنانچہ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر آئیں اور اظہار خیال کریں!" ان کی اناؤنسمنٹ پر مجھے ظہور نظر مرحوم یاد آ گئے۔ بہاولپور کے ایک مشاعرے میں اسٹیج سیکرٹری نے شاعر کا نام پکارنے سے پہلے کہا کہ اب میں جس شاعر کو دعوت سخن دے رہا ہوں' وہ جب اسٹیج پر آتے ہیں تو دلوں میں بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں۔ ہر سمت ایک اجالا سا ہو جاتا ہے ——— ابھی انہوں نے شاعر کا نام بھی نہیں پکارا تھا کہ ظہور نظر مرحوم اٹھ کر مائک کی طرف جانے لگے۔ اس پر اسٹیج سیکرٹری نے کہا ظہور صاحب یہ اناؤنسمنٹ آپ کے لئے نہیں تھی' آپ اپنے مقام پر بیٹھیں گے۔ اس پر ظہور نظر نے کہا اچھا؟ مگر پچھلے برس تو آپ نے یہ اناونسمنٹ میرے بارے میں کی تھی۔! سردار تارا سنگھ کامل کی اناونسمنٹ بھی اسی زمرے میں شامل تھی' جس کے بارے میں (To whom it may Concern) کے الفاظ بلا خوف و خطر کے جا سکتے ہیں۔ بہرحال مجھے سوائے اپنی ایک پنجابی غزل کے کچھ یاد نہ تھا۔ سو میں نے وہ غزل یہاں سنا دی سامعین میں اکثریت سکھوں کی تھی انہوں نے اتنی داد دی کہ میں پریشان ہو گیا۔ اور اس وقت مجھے اس کی وجہ سمجھ نہ آئی' بعد میں' میں نے اس غزل پر خود غور کیا' تو وجہ سمجھ میں آ گئی چار شعروں کی یہ غزل آپ بھی سن لیں شاید آپ کو بھی سمجھ آ جائے!

تیرے میرے سپنے سچے نکلن گے
ادھی رات نوں سورج پورے نکلن گے

گھپ ہنیریاں غاراں دے دروازے چوں
پیلے ہتھ مشالاں لے کے نکلن گے

ہتھاں دی دستک تے اک دن دیکھیں توں
بند گلی دے وچوں رستے نکلن گے

رانجھیاں دا اے خواب دی پورا ہووے گا
ہیراں دی بستی چوں کھیڑے نکلن گے!

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سید ضمیر جعفری نے یہاں اپنی ایک پنجابی نظم سنائی اور محفل لوٹ لی۔ پنجاب سے سینکڑوں میل دور حیدر آباد دکن میں پنجابی کی اس محفل نے دل کو ایک عجیب طرح کی مسرت سے بھر دیا اور ان لمحوں میں میں نے سوچا کہ مادری زبان سے جو ایک والہانہ محبت اور لگاؤ ہوتا ہے اور اسے بولتے ہوئے جس طرح سچ بولنے کا احساس ہوتا ہے' وہ کس قدر فطری ہے۔ اردو میری قومی اور ثقافتی زبان ہے' مجھے اس سے عشق ہے' لیکن پنجابی پنجابی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح ایک لاہوریئے نے حج بیت اللہ سے واپسی پر اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ میں قربان جاؤں اس شہر پر لیکن لاہور' لاہور ہے۔

تقریب سے فراغت کے بعد نظام کلب پہنچے تو سردار گھبیر سنگھ نے ہمارے لئے میزیں مخصوص کروائی ہوئی تھیں عشائیے میں ہم پاکستانی مہمانوں کے علاوہ اوم پرکاش بادل امریک سنگھ دلیپ سنگھ تاراسنگھ کامل لکشمن بہسانیہ راج نارائن راز سپروال اور بیگم سپروال کے علاوہ دوسرے دوست مدعو تھے نظام کلب کے برآمدے میں دکن کے نظاموں کی تصویروں کے ساتھ "فاتح حیدر آباد" جنرل چوہدری کی تصویر بھی آویزاں تھی گویا یہ تصویریں نہیں تھیں' تاریخ کا ایک ورق ہمارے سامنے کھلا پڑا تھا۔ یہ ورق میں نے غور سے پڑھا اور اس کے ساتھ منیر نیازی کی نظم "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" میرے ذہن کے دریچوں میں در آئی اگرچہ میں نے یہ دریچے بند کر دیئے کیونکہ یہ دریچے کھولنے میں بھی میں نے دیر کر دی تھی!

رات کو ڈیڑھ بجے واپس ہوٹل پہنچے!

بے بی تبسم کے لطیفے

صبح دس فروری تھی اور آج بین الاقوامی لطیفوں کا سیشن تھا۔ زندہ دلان حیدر آباد کے طالب خوند میری حمایت اللہ مصطفیٰ علی بیگ ڈاکٹر آنند راج ورما اور "شگوفہ" کے ایڈیٹر سید مصطفیٰ کمال کمرے میں آئے "پے بہ پے" تقریبات نے ان کی "مت" ماری ہوئی تھی' وہ اس بات پر معذرت کر رہے تھے کہ وہ مہمانوں کی صحیح طور پر مہمداشت نہیں کر سکے حالانکہ وہ

نہیں جانتے تھے کہ اس شہر نے مہمانوں کو کتنی محبت دی ہے اور یہ کہ مہمان اس طرح کی تقریبات میں منتظمین کی بے پناہ مصروفیات اور ان کی مجبوریوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ پھر انہوں نے ہماری دیکھ بھال کے لئے جن دوستوں کو مامور کیا تھا' وہ ہماری دیکھ بھال ضرورت سے زیادہ کر رہے تھے۔ عالمی مزاح کانفرنس سے وابستہ یہ دوست جو اس وقت میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کئی دنوں کی تھکن سے بے حال ہو رہے تھے ان کی آنکھیں رتجگوں کی وجہ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ یہ لوگ گذشتہ ایک ماہ سے "شگوفہ" کے ایک چھوٹے سے دفتر میں صبح آٹھ بجے سے رات کے دو دو بجے تک کانفرنس کے انتظامات میں مشغول رہے تھے گویا وہ گذشتہ ایک ماہ سے بیویوں کی جھاڑیں بھی کھا رہے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا!"

لطیفوں کے بین الاقوامی سیشن میں مشہور ٹی وی سٹار بے بی تبسم کمپیئر تھیں۔ یہاں ملک ملک کے لوگوں نے جو لطیفے سنائے سو سنائے' مگر جو لطیفے بے بی تبسم نے سنائے' ان میں سے کچھ "حدود آرڈیننس" کی حدود کو چھو رہے تھے! مثلاً مکمل تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک "عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا "اگر میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں تو؟" محبوبہ نے کہا "تو تم اس چور کی طرح بے وقوف سمجھے جاؤ گے جسے پوری کار چرانے کا موقع ملا' مگر اس نے صرف اسٹپنی چوری کرنے پر اکتفا کیا!" کمشنر لینڈ ریونیو دورے سوامی نے یہاں "لوک سبھا" کو جوک سبھا" کہہ کر محفل کو کشت زعفران بنا دیا! اس جشن قہقہہ میں کئی گھنٹے تک لوگ اتنا ہنسے کہ فضا میں اداسی پھیل گئی!

لنچ کے دوران میری نظر ایک گھٹے ہوئے بدن کے شخص پر پڑی جس کے چہرے پر ایک باوقار سی مسکراہٹ تھی اور وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا انہوں نے مجھے گلے لگا لیا' یہ پروفیسر مغنی تبسم تھے۔ پاکستان اور بھارت میں یکساں طور پر مانے جانے والے نقاد اور محقق۔ مجھے انتظار حسین کا ایک خط اور ان کا سفرنامہ بھارت "زمین اور فلک اور" بھی ان کے سپرد کرنا تھا اور آج میں احتیاطاً" یہ دونوں چیزوں اپنے ساتھ لے آیا تھا

Optimized by www.ImageOptimizer.net

——— میں نے یہ امانت ان کے سپرد کی۔ مجھے غیاث متین نے بتایا کہ مغنی تبسم اپنی اہلیہ کے اچانک انتقال کے بعد سے کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے غم کا سایہ ہم پر نہیں پڑنے دیا۔ انہوں نے سید ضمیر جعفری اور مجھے اگلے روز جامعہ عثمانیہ میں مدعو کیا تاکہ طلبہ و طالبات سے تبادلہ خیال ہو سکے۔

اور اب کھانے کے بعد ہم نے دور درشن (ٹیلی ویژن) والوں کو انٹرویو دینا تھا' اس کے بعد ثریا بیگم نے ریڈیو کے لئے انٹرویو کرنا تھا۔ پھر ہم نے صنعتی نمائش میں اردو کتابوں کے سٹال پر جانا تھا اور اس کے بعد رات کو حسن الدین احمد کے ہاں عشائیے میں شرکت کرنا تھی' گویا ان سارے پروگراموں میں "قیلولہ" کا پروگرام "مس" ہو رہا تھا!

آپ ہندوستان کا نام پاکستان رکھ لیں

جس ریسٹ ہاؤس میں لنچ کا اہتمام تھا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی یہیں ٹھہرے ہوئے تھے ٹیلی ویژن والوں نے اس ریسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم کو "سٹوڈیو" میں بدل دیا سید ضمیر جعفری کو پروفیسر مغنی تبسم اور مجھے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انٹرویو کرنا تھا انٹرویو میں تو جو باتیں ہوئیں سو ہوئیں اس سے اچھی باتیں تو انٹرویو سے قبل ڈاکٹر نارنگ کے کمرے میں پروڈیوسر اور اسسٹنٹ پروڈیوسر سے ہوئیں پروڈیوسر جن کا اچھا سا نام میں بھول گیا ہوں انٹرویو سے قبل پوری طرح "موڈ" میں تھے دوستانہ ماحول میں گپ شپ لگاتے ہوئے وفور محبت میں کہنے لگے "یار یہ کیا آپ لوگوں نے الگ پاکستان بنا لیا ہے آپ لوگ دوبارہ ہندوستان میں شامل ہو جائیں چاہے پورے ہندوستان کا نام پاکستان رکھ دیں!" میں نے کہا "آپ نے یہ تجویز غالباً" شیکسپیئر کو پڑھ کر پیش کی ہے جس نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے؟" ہنس کر کہنے لگے "نہیں میں سیریس ہوں؟" میں نے کہا "اگر آپ سیریس ہیں تو چلئے پھر میں بھی سیریس ہو جاتا ہوں" اور پھر میں واقعی سیریس ہو گیا "آپ کو پتہ ہے پاکستان بنانے میں آپ لوگوں کا کتنا ہاتھ ہے؟ ہم لوگ اگر آپ کے برتن چھو لیتے تھے تو یہ برتن پلید ہو جاتے تھے ہم ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے کاروبار ملازمت تعلیم کسی شعبے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں تھا ہمارے ساتھ آپ کا

سلوک وہی تھا جو آج جنوبی افریقہ کے سفید فام آقاؤں کا اپنی سیاہ فام رعایا سے ہے" میرے دوست یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے "وہ نسل تو ختم ہو گئی اب تو آپ کا معاملہ ہماری نسل سے ہو گا جو یقین کریں پرانی نسل سے بہتر ہے!" میں نے کہا "ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں لیکن آج بھی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے انتخابات میں آر۔ ایس۔ ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) جیت رہی ہے" کہنے لگے "ایسا ہر کہیں نہیں ہے انہیں کئی جگہ شکست بھی ہوئی ہے" میں نے کہا انہیں شکست دینے والوں کے نعرے ممکن ہے مختلف ہوں مگر اس سے صورت حال میں معیاری تبدیلی واقع نہیں ہوتی!" گفتگو کچھ مناظرے کی شکل اختیار کر رہی تھی جس کا احساس میرے علاوہ میرے اس دوست کو بھی ہوا چنانچہ وہ ہنس کر کہنے لگے "چلو ٹھیک ہے لیکن یہ دو ملکوں کے درمیان جو اتنی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیں گئی ہیں انہیں کچھ تو نیچا کریں!" میں نے کہا "یہ دیواریں نیچی ہی نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ان میں جگہ جگہ کھڑکیاں بھی ہونا ضروری ہیں" اس پر سید ضمیر جعفری جو نیم غنودگی کے عالم میں آنکھیں بند کئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "یہ کھڑکی کی بات عطا نے اس لئے بھی کی ہے کہ یہ تو کالم بھی "روزن دیوار" ہی کے عنوان سے لکھتا ہے!" اس دوران ایک خوبصورت غیر ملکی لڑکی معطر ہوا کے جھونکے کی طرح خراماں خراماں کمرے میں چلی آئی اس نے اتنے سارے "ڈشکروں" کو بیک وقت کمرے میں دیکھا تو کچھ دیر کے لئے ٹھٹھکی پھر اس نے کسی شخص کا نام لیا اور پوچھا کہ کیا وہ اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جنہوں نے آج ہی واپس دہلی جانا تھا کمرے میں بکھرا ہوا اپنا سامان یکجا کرنے میں مشغول تھے انہوں نے ایک نظر پہلے ہم سب کو دیکھا اور پھر اس حسینہ سے مخاطب ہو کر شائستگی سے کہنے لگے "نہیں محترمہ وہ اس کمرے میں نہیں ٹھہرے ہوئے اس کمرے میں میں مقیم ہوں میرا نام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہے فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" اس نے جواب میں کوئی خدمت بتانے کی بجائے "آئی ایم سوری؟ کہا جس کا اردو میں مطلب غالباً" یہ تھا کہ مجھے افسوس ہے میں آپ سے خدمت نہیں کرا

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سکتی کمرے میں موجود لوگ کوئی اتنے غلط نہیں تھے مگر جب انسان کسی تلاش میں ہو تو پھر نظروں میں شان سکندری بھی نہیں جچتی!

پاکستان ناقابل تردید حقیقت ہے

اس اثناء میں میرے پروڈیوسر دوست ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے جہاں وہ کیمرہ مینوں کو ہدایات دے رہے تھے اسسٹنٹ پروڈیوسر کشمیری پنڈت مسٹر منو تھے سرخ و سفید خوبصورت نوجوان چہرے پر نیشنی ڈاڑھی جس سے ان کی وجاہت میں اور اضافہ ہو گیا تھا انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا "میں بہت دیر سے آپ کی گفتگو سن رہا تھا مجھے آپ کی باتوں سے اتفاق ہے لیکن کیا مذہب کی بنیاد پر کسی ریاست کا قیام کوئی مناسب بات ہے؟" میں نے کہا "برادر عزیز! اگر رنگ نسل زبان کی بنیاد پر ریاستیں وجود میں آسکتی ہیں تو مذہب کی بنیاد پر کیوں نہیں؟ اور پھر دنیا میں تو بہت سے ایسے ملک ہیں اور بالکل برابر برابر میں واقع ہیں جو ایک ہی رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی علیحدہ اور خود مختار حیثیت قائم ہے جب آپس میں نہیں بنتی مفادات کا تصادم ہوتا ہے اور گھر کی دیواریں تنگ ہو جاتی ہیں تو دو بھائی بھی علیحدہ علیحدہ مکانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں لہٰذا قیام پاکستان کو گاؤ ماتا کی تقسیم سمجھنے کی بجائے اس حقیقت کو اگر خوش دلی سے تسلیم کر لیا جائے تو دو علیحدہ علیحدہ گھروں میں رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو سکتے ہیں ویسے بھی موجودہ پاکستان صدیوں سے جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے ایک علیحدہ یونٹ رہا ہے!" مجھے یہ نوجوان ہندوستان میں موجود اس گروہ کا فرد محسوس ہو رہا تھا جو کھلے دل و دماغ سے چیزوں کو پرکھتے اور پھر انہیں قبول یا مسترد کرتے ہیں چنانچہ مجھے اس نوجوان سے مکالمہ کرتے ہوئے دوری کی بجائے یگانگت کا احساس ہو رہا تھا۔

"ایک بات اور!" میں نے ایک نہایت نازک مسئلے کی طرف آتے ہوئے کہا "ہندوستان میں اس وقت آٹھ دس کروڑ مسلمان موجود ہیں اور وہ اکثریت کے ہاتھوں خود کو محفوظ تصور نہیں کرتے حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے 1947ء میں پاکستان آنے کی بجائے

ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور یوں انہوں نے انڈین نیشنلزم کے تصور کو عملی طور پر قبول کیا آپ نے انہیں اس کا کیا اجر دیا سکھ آپ کا دست و بازو تھے میں 1977ء میں ہندوستان آیا تو میں نے انہیں ہندوؤں سے زیادہ نیشنلسٹ پایا انہیں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا مگر آج 1985ء میں انہیں بھی اکثریت کے رویے سے شکایت ہے"۔

گفتگو بہت سنجیدہ ہو گئی تھی چنانچہ میں نے اس کی گھمبیرتا کو کم کرنے کے لئے کہا۔ اب تو سکھوں کا مسئلہ اس شعر کی تفسیر بن گیا ہے۔

کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں
کھڑکیوں کے کھڑکنے سے کھڑکتا ہے۔ کھڑک سنگھ

اس پر منو نے ہنستے ہوئے کہا "چلیں چھوڑیں ان باتوں کو آپ یہ بتائیں کہ اگر ہندوستانی سماج سے فرقہ واریت کا زہر ختم ہو جائے تو؟" میں نے کہا "وہ دن ہندوستان کے لئے روز سعید سے کم نہیں ہو گا مگر اس کے باوجود پاکستان کی ضرورت اسی طرح قائم رہے گی ہمارا روحانی ثقافتی اور معاشی تحفظ اسی خطے سے وابستہ ہے ہمیں ملازمتوں میں کاروبار میں تعلیم میں کسی اکثریت کے ساتھ مسابقت نہیں کرنا پڑتا چنانچہ پاکستان میں جو کچھ ہے وہ بلا شرکت غیرے ہمارا ہے اگر آپ کو ہم سے محبت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہم سے محبت ہے تو محبت میں اگر جدائی بھی محبت قائم رکھنے کا تقاضا ہو تو وہ برداشت کر لینی چاہئے!" منو میری بات کے آخری جملے پر مسکرائے اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد سنجیدہ انداز میں بولے "آپ کی بات اس لئے بھی میرے دل کو لگتی ہے کہ ہمارے کشمیر میں ایک خصوصی قانون کے تحت ہندوستان کے دوسرے علاقے کے لوگوں پر یہاں آباد ہونے پر پابندی ہے اور یوں ہمیں بھی اکثریت کے دباؤ سے نجات ملی ہوئی ہے اور اس طرح ہمیں معاشی تحفظ کا خاصا احساس ہوتا ہے بہر حال آپ سے گفتگو کر کے دلی مسرت ہوئی مجھے آج بہت سی باتیں سمجھنے میں مدد ملی ہے" میں نے خلوص دل سے اس خوبصورت ہندو نوجوان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا "آپ یقین کریں مجھے آپ سے کئی گنا زیادہ مسرت ہوئی ہے خدا کرے آپ خوش رہیں آباد رہیں

Optimized by www.ImageOptimizer.net

پھلے پھولیں ہمارے اور آپ کے درمیان موجود سب مسئلے خوش اسلوبی سے طے ہوں اور پھر ہم مل کر ہندوستان اور پاکستان کو خطہ جنت نشاں بنادیں!"

اس دوران کیمروں اور روشنیوں کی تنصیب کا کام مکمل ہو گیا تھا اور ایک کیمرہ مین ہمیں ڈرائنگ روم میں آنے کے لئے کہہ گیا تھا ڈاکٹر نارنگ پہلے ہی سے ڈرائنگ روم میں موجود تھے سید ضمیر جعفری سو رہے تھے مٹو ہمیں ریکارڈنگ کے لئے ڈرائنگ روم میں آنے کا کہہ کر کمرے سے جا چکے تھے میں نے ضمیر صاحب کو ہولے سے جگاتے ہوئے کہا "آپ نے قیلولہ تو کر لیا اب ریکارڈنگ بھی کروالیں!" ضمیر صاحب نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں اور کہا "قیلولہ کس کم بخت نے کیا ہے جاگ رہا تھا اور تمہاری سب باتیں سن رہا تھا میں نے سوچا نوجوانوں کی اس گفتگو میں بزرگوں کی مداخلت کو کہیں "غیر ملکی مداخلت" سمجھ کر دونوں فریق میرے پیچھے نہ پڑ جائیں!"

اراؤنڈ وی کلاک

ٹی وی کے لئے انٹرویو کی ریکارڈنگ کے بعد میں اور ضمیر جعفری ریڈیو سٹیشن جانے کے لئے ڈاکٹر نارنگ پروفیسر مغنی تبسم اور بیگ احساس کے ساتھ دو کاروں میں بیٹھ گئے ریڈیو سٹیشن پر ایگزیکٹو پروڈیوسر ثریا بیگم پہلے سے ہماری منتظر تھیں یہاں ڈاکٹر نارنگ پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر سلیمان اطہر نے ضمیر صاحب اور مجھ سے اردو کے مزاحیہ ادب کے حوالے سے گفتگو کی گفتگو کے آخر میں پروفیسر سلیمان اطہر نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجود "دیواریں" ڈھانے کی بات کی تو میرے احتجاج پر ڈاکٹر نارنگ نے انہیں وہیں ٹوک دیا اور بعد میں ثریا بیگم سے کہا کہ وہ یہ حصہ گفتگو میں سے حذف کر دیں!

اور اب ہمارا یہ حال تھا کہ ہم تھک کر چور ہو چکے تھے مگر ابھی ہمیں صنعتی نمائش پر روزنامہ "سیاست" کا اردو کتابوں کا سٹال دیکھنے کے لئے جانا تھا ہم جلدی جلدی ہوٹل پہنچے کہ چھ بجے "سیاست" والوں نے ہمیں لینے کے لئے آنا تھا مگر اس وقت شام کے سات بج رہے تھے پتہ چلا کہ سیاست کے جائنٹ ایڈیٹر ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بھائی اور اردو کے

نہایت سینئر صحافی اور ادیب محبوب حسین جگر ہمیں لینے کے لئے بنفس نفیس وقت مقررہ پر ہوٹل پہنچے تھے ہمیں اس پر بہت ندامت ہوئی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس دوران خواجہ معین الدین اور ذہانت بیگ ہمیں بک سٹال پر لے جانے کے لئے ہوٹل پہنچ گئے نمائش گاہ میں داخل ہوئے تو یوں لگا میلے میں آ گئے ہیں چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ سپیکر اور لوگوں کا وہ اژدہام کہ خدا کی پناہ! ایک سٹال کے قریب کیسٹ پر مزاحیہ مشاعرہ بھی چلایا جا رہا تھا میں نے سوچا کہ ہنسا حیدر آباد والوں کی جبلت کا حصہ بن چکا ہے یہاں اردو کی بعض بہت قیمتی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر جناب عابد علی خان صرف ایک اخبار کے مدیر اور مالک ہی نہیں بلکہ سیاسی ادبی اور سماجی سطح پر فعال ترین شخصیت ہیں انہوں نے صحافت کو مشن بنایا ہے عابد علی خان حیدر آباد میں سال بہ سال مشاعرہ بھی منعقد کراتے ہیں جس کی آمدنی فلاحی کاموں پر صرف ہوتی ہے اردو صحافت اور اردو ادب کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں عابد علی خان بطور ایک ہندوستانی شہری کے جہاں قوم کے مختلف طبقوں کے حقوق کے لئے سرگرم عمل ہیں وہاں بطور مسلمان انہوں نے مسلمانوں کو پسماندگی دور کرنے کے لئے بہت اہم اور دور رس اقدامات کئے ہیں صنعتی نمائش کے اس سٹال پر ادارہ "سیاست" کی طرف سے ہمیں نہایت اہم موضوعات پر شائع شدہ کتابوں کا ایک ایک سیٹ دیا گیا یہ کتابیں ادارہ "سیاست" ہی نے شائع کی تھیں ہم نے مہمانوں کی کتاب پر اپنے تاثرات لکھے اور بہت "سرعت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمائش میں سے نکلے کیونکہ اب ہمیں یہاں سے سابق سول سرونٹ اور حیدر آباد کی ممتاز علمی شخصیت جناب حسن الدین احمد کے ہاں عشائیے میں شرکت کے لئے جانا تھا!

حسن الدین احمد کی حویلی میں

اور جناب حسن الدین احمد کے پرانی وضع کی حویلی نما گھر میں داخل ہوتے ہی دل خوش ہو گیا ایک رئیسانہ انداز نفاست اور خوش ذوقی اس گھر کے در و دیوار سے ٹپک رہی تھی یہ خاندان نظام حیدر آباد کے مقربین میں سے رہا ہے چنانچہ اندر کمرے میں حضور نظام کی تصویریں اور تحریریں دیواروں پر آویزاں تھیں اہل خانہ خالص حیدر آبادی کلچر کا منہ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بولتا نمونہ! اور کھاتا اس کا مزید منہ بولتا نمونہ! نواب دین یار جنگ کے فرزند ڈاکٹر حسن الدین احمد انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس سے منسلک رہے ہیں آپ "ولا اکیڈیمی" کے بانی اور صدر ہیں ان کی کتابیں اردو الفاظ شماری ساز مضرب (دس حصے) انگریزی سے کئے گئے منظوم اردو ترجموں کا مجموعہ اور انجمن اور محفل (سوانحی مضامین کے مجموعے) ولا اکیڈیمی کے تحت شائع ہوئے ہیں ان کے سوانحی مضامین کا ایک مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے یہاں سے واپسی پر سید ضمیر جعفری اور میں نے حسن عسکری صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ ان کے طفیل ہمیں اس گھر میں آنے اور اس گھر کے خوبصورت مکینوں سے ملنے کی "پریو یلج" حاصل ہوئی!

حسن الدین احمد کا ڈرائیور ہمیں ہوٹل چھوڑ کر گیا تھا اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے ضمیر جعفری حسن عسکری اور میں لفٹ میں داخل ہوئے تو وہ حسب معمول نہایت پھرتی سے بند ہو گئی اور یوں ہم میں سے ایک آدھ "گراؤنڈ" ہوتے ہوتے رہ گیا ہم نے بھارت میں وقت کی قدر کنشکا ہوٹل کے بعد حیدر آباد کے اس سیمپورنا ہوٹل کی لفٹ سے سیکھی۔

میں فرسٹ فلور پر پہنچ کر لفٹ سے نکلنے لگا تو ضمیر صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا "میرے کمرے میں چلو گپ لگاتے ہیں!"

ضمیر کا سامنا

اب ضمیر صاحب اور میں آلتی پالتی مارے اپنے اپنے بستروں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے ضمیر صاحب نے اپنی نئی نکور بتیسی پانی بھرے گلاس میں سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی اور یوں میں ان کی اس مسکراہٹ سے محروم ہو گیا تھا جس پر انہیں ایک ٹوتھ پیسٹ بنانے والے ادارے کی طرف سے بہترین مسکراہٹ کا انعام بھی مل چکا ہے ضمیر صاحب آج صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مسلسل مصروف رہنے کے باوجود نہ تھکے تھے نہ بور ہوئے تھے کیونکہ اس دوران بوریت کے مخصوص سگنل کے طور پر نہ انہوں نے بطخ کی آواز نکالی اور نہ کسی اجنبی سے انمل بے جوڑ قسم کی گفتگو کی جس پر وہ بے چارا حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگتا اور اس

وقت بھی وہ ماشاء اللہ پوری طرح "فارم" میں تھے برصغیر کے اس مایہ ناز مزاح نگار میں بڑھاپے کا نہ چڑچڑاپن ہے نہ کہولت کے کوئی آثار ہیں اور نہ زندگی سے بیزاری کا کوئی رویہ ہے بلکہ انہیں دیکھ کر تو مایوس نوجوانوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے نظر بد دور وہ بھر پور زندگی گزارتے ہیں اور وہ خدا کی دی ہوئی اس خوبصورت زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے اور دوسروں کے لئے مزید خوشگوار بنانا چاہتے ہیں چنانچہ یہ بلبل رات گئے بھی چہک رہا تھا بتیسی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے منہ سے نکلنے والی ہوا اور آواز کے تناسب میں کچھ گڑبڑ سی ہو رہی تھی یوں بھی پوپلے منہ کی وجہ سے اس وقت وہ ضمیر صاحب کی بجائے ضمیر صاحبہ لگ رہے تھے ضمیر صاحب کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال ہیں اور وہ بالکل سیدھے تنے رہتے ہیں جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو میں سمجھا کہ شاید کسی بات پر انکے رونگٹے کھڑے ہوں تو پھر مستقل کھڑے رہتے ہیں اور اس وقت بھی ان کے یہ رونگٹے کھڑے تھے۔

"ضمیر صاحب میرا آگرہ دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے اس دفعہ دہلی سے آگرہ ضرور چلیں گے" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہے" ضمیر صاحب نے کہا "آگرے ضرور چلیں گے وہاں کا پینٹھا بڑا مشہور ہے!"

میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی مگر میرے حلق سے نکلنے والے قہقہے نے میری نیند کو سلا دیا ایک مزاح نگار ہی آگرے کی پہچان تاج محل کی بجائے پینٹھا قرار دے سکتا تھا اور یوں ایک مضحکہ صورت حال سے مزاح کو جنم دے سکتا تھا۔

زنباق تریہالکا زنباق تریہا

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی "جی بول رہا ہوں" ضمیر صاحب نے ٹیلی فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

مگر بھارت کا ٹیلی فون سسٹم ٹھیک نہیں تبھی تو پاک بھارت مذاکرات میں بھی ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دیتی شاید اسلیئے ضمیر صاحب نے ایک بار پھر اپنا فقرہ آواز کے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

پورے والیم سے دہرایا "جی جی بول رہا ہوں" مگر دوسری طرف آواز غائب! "اب بھی نہیں پہنچی تھی چنانچہ اس دفعہ ضمیر صاحب نے دھاڑتے ہوئے کہا "بول رہا ہوں جی بول رہا ہوں" تیسری دفعہ ضمیر صاحب نے ریسیور مجھے تھمادیا ضمیر صاحب کو کم از کم دوسری طرف سے تو آواز سنائی دی تھی جبکہ میں اس سے بھی محروم رہا تاہم پانچ منٹ تک پیشہ ور واعظوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر میں نے گفتگو کی اور پھر ٹیلی فون بند کر دیا میں نے ضمیر صاحب کو بتایا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ کال چندی گڑھ سے تھی اور آپ کے لئے تھی دوسری طرف گورنر ہریانہ جناب مظفر برنی کے سیکرٹری تھے جو گورنر صاحب کی طرف سے آپ کی بھارت آمد پر مسرت کا اظہار کر رہے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ آپ پاکستان واپسی سے قبل چندی گڑھ ضرور آئیں جہاں وہ آپ کے اعزاز میں کوئی تقریب رکھنا چاہتے ہیں چونکہ میں بھی آپ کیساتھ ہوں چنانچہ ان کی وفاداری کے طفیل اس پیغام کا مخاطب میں بھی تھا تاہم میں نے انہیں بتایا ہے کہ ہم لوگ یہاں سے پرسوں بمبئی جا رہے ہیں وہاں تین چار روز قیام کے بعد دہلی جائیں گے آپ وہاں ضمیر صاحب سے رابطہ قائم کر لیں اس پر سیکرٹری نے کہا کہ گورنر صاحب بھی ان دنوں میں بمبئی جانے والے ہیں چنانچہ وہ بمبئی میں رابطہ قائم کر لیں گے اس کے بعد آواز چونکہ بالکل ہی سنائی نہیں دے رہی تھی اس لئے میں نے فون بند کر دیا اور انہیں یہ بھی نہ بتا سکا کہ بمبئی میں ہم نے کہاں قیام کرنا ہے اس کا علم فی الحال خود ہمیں بھی نہیں ہے آپ کو کیسے ہو گا؟

"بھئی سبحان اللہ کیا سمری پیش کی ہے!" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ویسے برنی صاحب بہت صاحب علم آدمی ہیں اور مجھ سے پرانے محبت کرنے والے ہیں ان سے ملے بغیر جانے کو میرا اپنا جی بھی نہیں چاہتا!"

ضمیر صاحب کی بات غائب! "ابھی ادھوری تھی مگر میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا "ضمیر صاحب ایک شعر سنیئے!"

"ارشاد!"

اس پر میں نے پوری سنجیدگی سے انہیں یہ شعر سنایا

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہا
زنباق تریہا لکا زنباق تریہا

ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "اس کا مطلب کیا ہے؟" میں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے بستر کی چادر بطور دھوتی کمر کے گرد باندھی اور کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے نیند آ رہی ہے!"

صبح جب آنکھ کھلی تو سابقہ تجربوں کی طرح اس دفعہ بھی دھوتی میں نے اوپر لی ہوئی تھی میں نے گھبرا کر ضمیر صاحب کے بستر پر نظر ڈالی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھے مگر وہ اتنی صبح کہاں چلے گئے میں یہ سوچ کر دوسرے ہی لمحے میں کچھ گھبرا سا گیا مگر کمرے میں موجود ملگجی روشنی میں اچانک میری نظر سامنے کھڑکی کی طرف پڑی تو دیکھا ضمیر صاحب سجدے میں گرے تھے انہوں نے سلام پھیر کر دعا مانگی اور اٹھ کر اپنے بستر کی طرف آنے لگے تو مجھے جاگتا دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے مجھے یوں لگا جیسے رب اور اس کے بندے کے درمیان ہونے والے مکالمے سے کسی تیسرے شخص کی آگہی نے انہیں پریشان سا کر دیا ہے!

وہ کون تھا؟

شیو وغیرہ سے فراغت کے بعد ضمیر صاحب اور میں ناشتے کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر ہلکا سا "ناک" کیا میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک نوجوان سامنے کھڑا تھا میں اس نوجوان کو گذشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے یا ضمیر صاحب سے اس دوران کبھی بات نہیں کی بس محبت سے دیکھتا رہتا تھا یا ہمہ وقت ہمیں کوئی سہولت بہم پہنچانے کے لئے مستعد رہتا تھا میں نے اسے صبح صبح اپنے سامنے کھڑے پایا تو دل خوش ہوا کہ صبح کا آغاز اچھا ہوا ہے اس نے ایک ہاتھ میں بڑا سا ٹفن کیریر پکڑا ہوا تھا میں دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا اور کہا "آئیں اندر تشریف لائیں" مگر اس نے ٹفن کیریر مجھے تھماتے ہوئے کہا "میں آپ کے کمرے میں گیا تو دروازہ "لاک" تھا میں نے سوچا آپ یہاں ہوں گے میں ضمیر

Optimized by www.ImageOptimizer.net

صاحب اور آپ کے لئے ناشتہ لایا ہوں" اور پھر وہ کچھ کہے بغیر واپس لوٹ گیا میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا اندر آکر میں نے ٹفن کیریر کھولا تو اس میں پراٹھے آملیٹ بھنا ہوا قیمہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا گذشتہ روز میں اپنے دوستوں میں سے کسی سے کہہ رہا تھا کہ یار ہوٹل کے روٹین کے ناشتے سے بیزار ہو گیا ہوں اس وقت یہ نوجوان کہیں قریب کھڑا سن رہا تھا اور اب تھوڑی دیر پہلے وہ چپکے سے ٹفن کیریر پکڑا کر چلا گیا ہے مجھے اس شخص کا نام بھی یاد نہیں غالباً" اس کا نام منظور ہے مگر میں اسے ساری عمر نہیں بھول سکتا غریب شخص کا یہ خلوص بڑی بڑی ضیافتوں پر بھاری تھا! میں بہت کم آبدیدہ ہوتا ہوں مگر اس وقت میری آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے! میرے دوست! خدا تمہیں خوش رکھے اور خدا کرے تم اور تمہارا محبت بھرا شہر جملہ آفتوں سے محفوظ رہے!

کچھ دیر بعد کنور مہندر سنگھ بیدی' مجتبیٰ حسین' غیاث متین' مسیح انجم اور بیگ احساس آگئے کنور منور سنگھ بیدی آج رات عالمی مزاح کانفرنس کے سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کے لئے حیدر آباد پہنچے تھے اور اس وقت ہم سب ان کی گل افشانی گفتار دیکھ رہے تھے حالانکہ اس وقت ان کے سامنے ساغر و مینا بھی نہیں تھے میرے جہازی سائز کے "اٹیچی کیس" کا تالا بیکار ہو گیا تھا اور کیمرے میں فلم پھنس گئی تھی مزاح نگار مسیح انجم نے اپنی مخصوص ہنسی ہنستے ہوئے کہا "عطاء بھائی! کوئی کام ہو تو بتائیں!" "اگر مسیح انجم کو پتہ ہو تا کہ میں انہیں کیا کام بتاؤں گا تو وہ مجھ سے کبھی کام نہ پوچھتے مگر اب تو صیاد اپنے دام میں خود آگیا تھا چنانچہ میں نے اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسیح انجم سے کہا "اگر اس سلسلے میں کوئی "مسیحائی" ہو سکتی ہو تو اسے خالی کر کے لے جائیں" کیمرہ بیگ احساس نے مجھ سے لے لیا کہ یہ میں راستے میں ٹھیک کروا تا جاؤں گا! مہمانوں کی خوش قسمتی کہ انہیں ایسے میزبان ملے اور میزبان بے چارے تو ایسے مواقع پر مروت میں بہت کچھ کہا ہی کرتے ہیں پیارے میزبانو! ہمارا کہا سنا معاف کرنا!

عابد علی خان کا ظہرانہ

دوپہر کو جناب عابد علی خان کے خوش ذوق صاحبزادے ڈاکٹر زاہد علی خان کے ساتھ ہم خاں صاحب کے ظہرانے میں شرکت کے لئے ان کے گھر پہنچے تو وہاں کنور مہندر سنگھ بیدی' سید کٹر شاہ' صدر نشین قانون ساز کونسل آندھرا پردیش' محبوب حسین جگر' مجتبیٰ حسین' بہاؤ الدین بابہ' خواجہ معین الدین اور ہلال سیوہاروی پہلے سے موجود تھے آندھرا پردیش کی قانون ساز اسمبلی کے سپیکر سید کٹر شاہ سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی مگر وہ کچھ اس طرح ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں کھانے سے پہلے مختلف موضوعات پر گپ شپ کے دوران میں نے عابد علی خاں سے پوچھا کہ ایڈیٹر "سیاست" ہونے کے حوالے سے آپ کو بھارت میں آزادی صحافت کے راستے میں کوئی دشواری محسوس ہوتی ہو بتائیں یہ سوال میں نے ایسے پوچھا جیسے میرا دورہ بھارت یہ دشواریاں دور کرنے ہی کے سلسلے میں ہے خدا کا شکر ہے کہ اس کے جواب میں خاں صاحب نے یہی کہا کہ بھارت میں صحافت پوری طرح آزاد ہے اسی طرح میرے اس سوال کے جواب میں کہ سچ لکھنے کی پاداش میں اخباری کاغذ کا کوٹہ یا اشتہارات تو کم نہیں ہو جاتے وہ کچھ حیران سے ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک بھارت میں اخبارات کے ضمن میں اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے جاتے غالباً" دوسرے قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہوں گے کیونکہ دنیا میں کوئی حکومت بھی فی الحال اتنی شریف نہیں ہے میر عابد علی خان دھیمے لہجے میں اور ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے ہیں اور ان کی پیروی میں مجھے بھی اس میر کا انداز اپنانا پڑ رہا تھا سو ان لمحوں میں "برادرم" ولی دکنی کا یہ مصرعہ یاد آئے۔

سوال آہستہ آہستہ' جواب آہستہ آہستہ تاہم پہلا مصرعہ دانستہ ذہن سے محو کر دیا کہ پردیس میں ایسے مصرعے یاد رکھنے سے اخلاق خراب ہوتا ہے!

جامعہ عثمانیہ میں

کھانا کھاتے کھاتے دوپہر کے دو بج گئے تھے' اب یہ اچھا تو نہیں لگتا تھا کہ اس کے فوراً

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بعد میزبانوں سے اجازت مانگیں اور رفو چکر ہو جائیں مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا' کیونکہ ڈھائی بجے ہمیں جامعہ عثمانیہ پہنچنا تھا جہاں شعبہ اردو کے اساتذہ نے طلبہ و طالبات سے ہماری ملاقات کا اہتمام کیا تھا بیگ احساس جو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہیں گاڑی لے کر پہنچ چکے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کی یہ پر شکوہ عمارت دیکھی اور اس کا ماضی یاد کیا تو دل پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی کیسے کیسے لوگ اس عظیم الشان یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں اور فروغ تعلیم کے علاوہ اردو کے سلسلے میں اس یونیورسٹی نے کتنی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں مجھے علم نہیں کہ آج یہ یونیورسٹی اپنی عظیم روایات سے کس حد تک وابستہ ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بڑی روایتیں اگر کمزور بھی ہو جائیں تو ان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت پھر بھی موجود رہتی ہے۔ اور کسی بھی وقت یہ چیز ان کے احیاء کا باعث بن جاتی ہے' آرٹس فیکلٹی کے پر شکوہ اور وسیع و عریض برآمدوں سے ہوتے ہوئے جب ہم سیڑھیاں طے کر کے شعبہ اردو میں پہنچے تو وہاں پروفیسر مغنی تبسم صدر شعبہ ڈاکٹر جعفر صاحب' ریڈر غیاث متین اور دیگر اساتذہ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کمرے میں تھے جہاں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا اور جہاں طلبہ و طالبات کافی دیر سے ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر جعفر صاحب کے ابتدائی صدارتی کلمات کے بعد غیاث متین نے سید ضمیر جعفری اور راقم کے حوالے سے کچھ گفتگو کی سید ضمیر جعفری نے جامعہ عثمانیہ کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا بعد ازاں میں نے اپنے سفرنامہ امریکہ کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا' ضمیر صاحب سے ایک ایک کر کے ان کی کتنی ہی نظمیں سنی گئیں جامعہ عثمانیہ کی صورت میں حیدر آباد کی علمی و ادبی اور تہذیبی عظمت کا ایک اور چشم دید نقش ہمارے دلوں میں ثبت ہو چکا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر کار کی طرف جاتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم نے کہا "ابھی آپ کو چھٹی نہیں ملے گی ابھی تو ہم آپ کو لائبریری اور اس کے ایک حصے میں موجود انتہائی نادر مخطوطے دکھائیں گے" فاطمی صاحب کی رہنمائی میں مخطوطے کیا دیکھے' پردیس میں ڈاکٹر وحید قریشی اور

مشفق خواجہ یاد آ گئے اگر ہمارے یہ مایہ ناز محققین یہاں ہوتے تو "پتھلا" مار کر یہیں بیٹھ جاتے اور ہلنے کا نام نہ لیتے مگر ضمیر صاحب نے کچھ دیر بعد بطخ کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں' شاید اس دفعہ یہ بوریت کا سگنل ہو!

پروفیسر مغنی غیاث متین اور بیگ احساس یہاں سے ہمیں برابر والے بلاک میں لے گئے' جہاں ہفتے میں کنگرو انجمن استادان فارسی ہند "یعنی فارسی اساتذہ کی ساتویں کل ہند کانفرنس منعقد ہو رہی تھی منتظمین کو یونیورسٹی میں ہماری آمد کی پیشگی اطلاع تھی چنانچہ انہوں نے پروفیسر مغنی تبسم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے سہی مگر اس کانفرنس میں ضرور شرکت کریں! یہاں فلسفہ کے نامی گرامی استاد پروفیسر کرن ناتھ ریڈی صدارت کر رہے تھے۔ اس کانفرنس کا اہتمام کرنے والی انجمن کے صدر پروفیسر سید امیر حسن عابدی (استاد دلی یونیورسٹی) مقامی صدر پروفیسر (خانم) شریف النساء انصاری (استاد عثمانیہ یونیورسٹی) اور ناظم انجمن پروفیسر نور الحسن انصاری (دلی یونیورسٹی) ہیں مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ بھارت کی 130 یونیورسٹیوں میں 56 یونیورسٹیوں میں فارسی تعلیم کا انتظام ہے البتہ جس علم کے ساتھ رزق وابستہ نہ ہو وہ علم نافع تو ضرور رہتا ہے مگر اس علم کے حصول کے خواہش مند آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور فارسی کے سلسلے میں تو یہ دشواری اور بھی زیادہ ہے کیونکہ "پڑھو فارسی بیچو تیل" والا "سلوگن" تو یوں بھی کافی عرصے سے چلا آ رہا ہے بھارت میں اردو سے محبت رکھنے والے لوگ تو اردو کو "ڈرپ" لگا کر زندہ رکھے ہوئے ہیں جو یہیں جمی پلی اور بڑھی' فارسی تو پھر بدیسی زبان ہے!

جیلانی بانو اور انور معظم

اب ساڑھے پانچ ہو چکے تھے ہم سات بجے جیلانی بانو اور انور معظم کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ چنانچہ بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچے منہ پر پانی کا چھٹا مارا' کپڑے تبدیل کئے اور پھر مسیح انجم کے ساتھ اپنے خوبصورت میزبانوں کے ہاں پہنچے یہاں طنز و مزاح کانفرنس کے منتظمین نے پہلے سے ٹیلی فون پر جیلانی بانو سے کہہ رکھا تھا کہ مہمانوں کو ہر صورت میں آٹھ بجے تک مشاعرہ گاہ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

میں پہنچا دیا جائے طنز و مزاح پر مشتمل اس مشاعرے کے مہمان خصوصی سید ضمیر جعفری تھے اور صدارت گورنر آندھرا پردیش شری گوپال شرما کر رہے تھے' چنانچہ جب ہم جیلانی بانو اور انور معظم کے ہاں پہنچے تو جیلانی بانو نے کھانا پہلے سے میز پر سجایا ہوا تھا میں جیلانی بانو کے افسانے کا تو پہلے سے قائل تھا اب ان کے کھانے کا بھی قائل ہو گیا۔ ان کا افسانہ اور کھانا ایک بار شروع کر دیں تو ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیلانی بانو آج بھی بہت گریس فل دکھائی دیتی ہیں وہ پاکستان آچکی ہیں اور یہاں کے احباب کو بہت یاد کرتی ہیں فیض صاحب کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ حیدر آباد آتے تو اسی گھر میں ان سے گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ وہ اندر سے البم اٹھا لائیں' جس میں فیض صاحب کے ساتھ اتری تصویروں کے علاوہ ان کی پاکستان یا تراکی تصویریں بھی سجی ہوئی تھیں۔ یہ تو میں آپ کو بتلانا بھول ہی گیا کہ یہاں ہماری ملاقات احمد جلیس سے بھی ہوئی۔ احمد جلیس جیلانی بانو کے بھائی ہیں اور ریڈیو میں ایگزیکٹو پروڈیوسر ہیں ادب سے ان کی وابستگی بہت گہری ہے جیلانی بانو کے میاں انور معظم اردو ادب میں پی ایچ ڈی ہیں اور اہل علم حلقوں میں اپنے علم اور شرافت سے پہچانے جاتے ہیں انور معظم اور جیلانی بانو کے بچے صورت اور سیرت میں اپنے ماں باپ پر گئے ہیں مجھے یہ چھوٹا سا گھر بہت خوبصورت لگا آپ کو بتانے کی ایک بات یہ بھی رہ گئی کہ جیلانی بانو نے فیض صاحب کے ساتھ اتری ہوئی تصویروں کے علاوہ فیض صاحب کا ایک خط بھی ہمیں پڑھایا جو انہوں نے آج سے تیس (30) برس پیشتر 1955ء میں جیلانی بانو کو لکھا تھا چلئے یہ خط آپ بھی پڑھ لیں۔

141 ایمپریس روڈ لاہور

28 جون

جیلانی بانو صاحبہ آپ کی عمر دراز معلوم ہوتی ہے' جیل میں آپ کی تحریریں اکثر نظر سے گزریں تعارف کی خواہش تھی لیکن معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں اس لئے آپ کے خط سے بہت مسرت ہوئی۔

میرے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو خیر مبالغہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ

آپ لوگوں کی دوستی اور خلوص مبالغہ نہیں' حقیقت ہے اور جو مبالغہ بھی ہے تو کم وجہ مسرت نہیں اس کا شکریہ ادا کرنا تو تکلف ہو گا لیکن اس کی وجہ سے کنج قفس میں جو فراغ اور آسودگی نصیب رہی ہے بیان نہیں کر سکتا۔

ادبی تحریکوں کے موجودہ حالات مجھے تفصیل سے معلوم نہیں اگرچہ ان کا کچھ اندازہ ضرور ہے ان کی تنظیم اور اصلاح اصل میں تو آپ نئے لکھنے والوں کا کام ہے اور آپ ہی اسے پورا بھی کریں گے۔ ادیب کا بنیادی کام تو لکھنا ہے تحریکیں اور انجمنیں اہم سہی لیکن ان کی اہمیت تو ادبی تخلیق ہی کے واسطے سے ہے یوں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے دونوں پر توجہ ہونا چاہئے لیکن زیادہ اہمیت پھر بھی تخلیق ہی کی ہے جو تحریک کا مقصود ہوتی ہے اس لئے آپ لوگ جو لکھتے ہیں بہرصورت محض داؤ بتانے والوں سے زیادہ اہم ہے بشرطیکہ وہ زندگی اور حقائق کے متعلق اپنے فکر کی تربیت میں کوتاہی نہ برتیں۔ میدان حشر کی طرح اس میدان میں بھی اپنا بوجھ ہر کسی کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے لیکن یہ تو میں نے وعظ شروع کر دیا خیر ہٹائیے یوں بھی خط کافی لمبا ہو گیا ہے اس لئے رخصت چاہتا ہوں ہمارا قصہ ابھی طے نہیں ہونے پایا فی الحال ضمانت پر ہیں نجات ہو گئی تو پھر کبھی گفتگو ہو گی۔

احباب سے سلام کہیے۔

فقط مخلص

فیض

کوئے یار سے نکلے
تو سوئے دار چلے

اور اب یہاں سے ہمیں "سوئے دار" جانا تھا سو کچھ دیر بعد ہم مشاعرہ گاہ میں تھے فٹ بال گراؤنڈ میں منعقد ہونے والے اردو ہندی کے اس مخلوط مشاعرے میں پندرہ ہزار کے قریب سامعین موجود تھے خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں موجود تھی جن کے لئے پردے کا خصوصی اہتمام تھا مگر شاعروں سے کیا پردہ؟ چنانچہ سٹیج اور "زنان خانے" کے درمیان کوئی قنات حائل نہیں تھی۔ صدارت گورنر صاحب کی تھی مہمان خصوصی سید ضمیر جعفری کے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

علاوہ سید کمٹر شاہ سپیکر قانون ساز اسمبلی تھے۔ ان کے برابر میں نواب شاہ عالم خاں بیٹھے ہوئے تھے مشاعرے کی نظامت کنور مندر سنگھ بیدی کے سپرد تھی اور مشاعرہ گاہ کا انتظام فوج کے سپرد تھا۔ یہ تو ایک طرح سے فوج کے اختیارات محدود کرنے کی بات ہے کیونکہ فوج مشاعرہ گاہ تو کیا پورے ملک کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

سٹیج پر میرے ساتھ ڈاکٹر رام پر شاد بیٹھے تھے۔ پھر سید کمٹر شاہ تھے۔ ان کے ساتھ گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما' نواب شاہ عالم خان اور سید ضمیر جعفری تشریف فرما تھے مشاعرے میں خواتین کے لئے پردے کا معقول انتظام تو تھا ہی لیکن چونکہ یہ اردو ہندی مشاعرہ تھا لہٰذا اس کی نظامت بھی دو حصوں میں "بٹ" گئی۔ اردو شعراء کا تعارف کنور مندر سنگھ بیدی کروا رہے تھے جب کہ ہندی شعراء کا تعارف ایک اور صاحب کے ذمے تھا جن کا نام حافظے سے اتر گیا ہے تاہم یہ جوڑ برابر کا نہیں تھا۔ کنور مندر سنگھ بیدی ایک مجلسی آدمی ہیں اور ان کی ذات میں تہذیبی رچاؤ اس قدر ہے کہ مخاطب ان کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کی ساری عمر شاعروں اور مشاعروں میں بسر ہوئی ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مائک سنبھالا تو پھر ایک بلبل تھا جس کی چہکار کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ مشاعرے کے آغاز میں انہوں نے ہندو' سکھ' مسلم بھائی چارے کے حوالے سے کچھ باتیں کیں۔ مگر گفتگو کا یہ حصہ وہ تھا جس میں تاثیر کی کمی محسوس ہوئی۔ کنور مندر سنگھ بیدی انڈین نیشنلزم پر یقین رکھنے والے سکھ ہیں۔ وہ لاکھ فراخدل سہی مذہب سے ان کا تعلق بالکل ذاتی نوعیت کا سہی' لیکن بڑے سے بڑا سیکولر شخص بھی اپنی کمیونٹی کے دکھ سکھ سے الگ نہیں رہ سکتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سکھوں پر ہونے والی زیادتیوں سے ان کا دل دکھا ہوا ہے ان کے سارے خواب بکھر گئے ہیں۔ مگر یہ بکھرا بکھرا شخص خود کو مجتمع کر کے لوگوں کو ایک بار پھر پیار اور محبت کا درس دے رہا تھا۔ لیکن لگتا تھا جیسے اسے خود بھی اپنے بھاشن کی تاثیر کے بارے میں شبہ ہے۔ تاہم اس سے قطع نظر انہوں نے مشاعرے کی نظامت کے دوران ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑیں کہ محفل کشت زعفران بنی گئی اور یوں انہوں نے مشاعرے میں سامعین کی دلچسپی کسی بھی مرحلے پر کم نہیں ہونے دی۔ کنور

مندر سنگھ بیدی جب تھک جاتے تو تھوڑی دیر کے لئے قنات کے پیچھے چلے جاتے اور بذریعہ "گرائپ واٹر' دوبارہ' چارج" ہو کر واپس آتے۔ ٹھیک رات کو بارہ بجے نظامت کے دوران انہوں نے سٹیج پر کھانا بھی کھایا۔ بیدی صاحب کی عمر اس وقت اسی برس کے لگ بھگ ہے۔ مگر ان کی زندہ دلی انہیں عمر کے بیس بائیس برس کے عرصے میں رکھے ہوئے ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے اعلان کیا "حضرات! مجھے خواتین کی طرف سے ایک چٹ موصول ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سٹیج پر موجود شعراء تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ جائیں کیونکہ خواتین میری شکل دیکھنا چاہتی ہیں"

آندھرا پردیش کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما گاندھی ٹوپی' شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے بھاری تن و توش اور قد چھوٹا مگر آدمی باذوق اور مزے کے تھے۔ انہوں نے مزاحیہ مشاعرے کی مناسبت سے یہاں تقریر بھی شگفتہ کی۔ انہوں نے کہا "دکن کے فرسٹ سیٹیزن" ہونے کے ناطے سے میرا حق بنتا ہے کہ میں دکنی زبان میں تقریر کروں" چنانچہ انہوں نے اپنی مختصری تقریر پرانے دکنی لہجے میں کی۔ جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔

انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا "اب آپ "لوکاں" کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ کیونکہ آپ شعراء کی "باتاں" سننے کے لئے یہاں آئے ہیں "ڈاکٹر شرما مشاعرے کے دوران سرگوشی کے انداز میں بعض شاعروں پر دلچسپ جملے بھی کستے رہے۔ ایک دوبار تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے انہیں اپنی گورنری پر بہت غصہ آ رہا ہے جس کے پروٹوکول نے انہیں باندھ کر سٹیج پر بٹھا رکھا ہے۔ ورنہ ان کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ بھی سامعین میں بیٹھے ہوتے اور جی کھول کر ہوٹنگ کرتے! بلکہ سپاہیوں کو سنگترے کے چھلکے بھی مارتے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

گرماگرم سیاسی تقریریں

اور اب اگر مشاعرے کے بارے میں آپ میری رائے پوچھیں تو سچی بات یہ ہے کہ اتنے وسیع و عریض پیمانے پر منعقد ہونے والے اس اردو ہندی مشاعرے کا مجھے اتنا مزا نہیں آیا۔ جتنا آنا چاہئے تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مزاح لکھنا یا مزاح کہنا اتنا آسان نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دوسری اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے والے تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں مگر مزاح لکھنے والے ادیب انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اب چونکہ یہ مشاعرہ طنز و مزاح کے حوالے سے تھا اور اسے کم از کم رات کے دو بجے تک چلنا بھی چاہئے تھا۔ چنانچہ شاعروں کی ایک کھیپ یہاں اپنا سنجیدہ کلام بھی مزاح کے نام پر سنا گئی۔ اردو کے شعراء نے تو پھر بھی اپنے خیالات کو منظوم کرکے پیش کیا اور ان میں بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر ہندی کے شاعروں نے تو کمال کردیا۔ انہوں نے بجائے کلام سنانے کے سٹیج پر آکر تند و تیز سیاسی تقریریں شروع کردیں۔ پہلے میں سمجھا کہ آزاد نظمیں پڑھ رہے ہیں۔ پھر میں نے قیاس کیا کہ آزاد نہیں نثری نظمیں ہیں۔ مگر مزید غور کیا تو معلوم ہوا کہ نہ آزاد نظمیں ہیں نہ نثری نظمیں ہیں بلکہ تقریروں میں لطیفوں کا پیوند لگا کر سیاست پر اظہار خیال فرمایا جارہا ہے۔ ایک شاعر نے تو کمال کردیا۔ اس نے ایک مشہور معاشرتی لطیفے میں ترمیم کرکے اسے سیاسی بنایا اور پھر اس میں پورا زہر بھر کر سنادیا۔ اس کی متذکرہ "نظم" کا خلاصہ یہ تھا کہ لوگ ایک ارتھی اٹھائے جارہے تھے اس ارتھی کے ساتھ ایک کتا تھا اور اس کتے کے پیچھے ہزاروں لوگ قطار اندر قطار چلے جارہے تھے۔ ایک راہ گیر نے ارتھی کے ساتھ ساتھ چلنے والے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا میرے کتے نے ایک سیاسی لیڈر کو کاٹ لیا ہے جس کے نتیجے میں وہ لیڈر مرگیا۔ یہ ارتھی اسی لیڈر کی ہے۔ اس پر راہ گیر نے کہا کیا تم یہ کتا مجھے ایک دن کے لئے نہیں دے سکتے؟ میں یہ کتا "دہلی" لے جانا چاہتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے کہا تم بھی اس قطار میں لگ جاؤ۔ یہ سب لوگ یہ کتا "دہلی" لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ جرات اظہار غالباً اشتعال انگیز بھی تھی مگر اس سے قطع نظر اس مشاعرے میں مجموعی طور پر مجھے جس چیز

نے چونکایا۔ وہ سامعین اور شعراء کی سیاسی بیداری' مسائل کے بارے میں ان کا شدید ردعمل اور ان مسائل پر اظہار خیال کے حوالے سے ان کا بے باکانہ رویہ تھا۔ یہاں اردو اور ہندی کے شعراء نے جن مسائل پر پوری جرات سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں رہنماؤں کی منافقت' فرقہ واریت' غربت اور افلاس کے مسائل سرفہرست تھے۔ اردو کے ایک شاعر ہلال سیوہاری کا قطعہ تو مجھے یاد نہیں رہا البتہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایک لیڈر نے مجھ سے کہا کہ بیروت میں قتل عام ہو رہا ہے اسے روکنا چاہئے۔ میں نے اسے کہا اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ قتل عام دیکھنا ہے اور اسے روکنے کی خواہش ہے تو آسام سے ہو آؤ۔

تھوڑی دیر بعد میں سٹیج سے اٹھ کر پیچھے مجتبیٰ حسین نریندر لوتھر اور ڈاکٹر بیگ احساس کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ اب میں مشاعرہ گاہ سے کھسکنا چاہتا تھا۔ مجتبیٰ حسین نے کہا "تم اپنا کلام نہیں سناؤ گے" میں نے کہا "میں مزاحیہ شعر نہیں کہتا"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" مجتبیٰ حسین نے کہا "تم اپنی سنجیدہ غزل پڑھ دو لوگ اسے مزاحیہ ہی سمجھیں گے"

مگر میں نے اس ستم ظریف کی بات پر کان نہ دھرا اور کھسکتے کھسکتے قناتوں کے پیچھے چلا گیا وہاں غیاث متین پر نظر پڑی تو میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے ہوٹل چھوڑ آئیں اور جب میں اور غیاث متین پنڈال سے باہر نکل رہے تھے۔ میں تھوڑا آگے آگے چل رہا تھا میں نے احتیاطاً" پیچھے مڑ کر دیکھا تو غیاث متین نظر نہ آئے۔ میں واپس آیا اور میں نے دیکھا کہ غالباً مجسٹریٹ یا سفید کپڑوں میں ملبوس کوئی پولیس آفیسر چیخ چیخ کر غیاث متین سے کہہ رہا ہے "میں کہہ رہا ہوں تم نیچے بیٹھ جاؤ"

"آپ تمیز سے بات کریں۔ میں اس طرح نیچے نہیں بیٹھوں گا"

"تمہیں بیٹھنا پڑے گا"

"میں نہیں بیٹھوں گا"

غیاث متین کے ساتھ ایک اور صاحب تھے بعد میں پتہ چلا یہ ایڈووکیٹ ہیں۔ وہ

Optimized by www.ImageOptimizer.net

غیاث متین سے زیادہ ان صاحب کے توہین آمیز رویہ پر مشتعل تھے۔ چنانچہ غیاث متین تو تھوڑی دیر میں پیچھے ہٹ گئے۔ مگر یہ ایڈووکیٹ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکے۔ غیاث متین اور یہ ایڈووکیٹ پنڈال میں سے گزر رہے تھے کچھ سامعین کو ان کی وجہ سے شعراء کو دیکھنے میں رکاوٹ محسوس ہوئی۔ جس پر "لاء اینڈ آرڈر" کے یہ محافظ فوراً جائے واردات پر پہنچے اور نہایت توہین آمیز انداز میں انہیں زمین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جس پر انہوں نے احتجاج کیا۔ ایک تو مجھے ان کا یہ احتجاج اچھا لگا اور دوسرے اس افسر کی معاملہ فہمی بھی کیونکہ کچھ دیر بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے خود ہی دوسری طرف چلا گیا حالانکہ وہ اسے الٹا کا مسئلہ بھی بنا سکتا تھا۔

مس گیلینا "ڈرائریکٹ ڈائیلنگ"

میں سارے دن کا تھکا ہوا تھا چنانچہ ہوٹل پہنچتے ہی سو گیا۔ ضمیر صاحب کہیں رات کو لیٹ مشاعرے سے لوٹے تھے چنانچہ وہ ابھی تک سو رہے تھے میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور ناشتے کے لئے اکیلا نیچے ریستوران میں آگیا۔

وہاں ایک میز پر "ہاؤس آف ہیومر" بلغاریہ کی مس گیلینا اور مسٹر اسٹیفن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ان کے ساتھ ہی "ٹکی" ہو گیا۔

"مسٹر اسٹیفن آپ کے حال کیسے ہیں؟" میں نے گیلینا کی بجائے اسٹیفن کو مخاطب کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ اسٹیفن انگریزی نہیں جانتے چنانچہ گفتگو مس گیلینا ہی کے توسط سے ہو گی۔ حالانکہ میرا ارادہ مسٹر اسٹیفن کے توسط سے مس گیلینا سے بات کرنے کا تھا۔

گیلینا نے بلغارین میں میری بات اسٹیفن تک پہنچائی۔ ان لمحوں میں مجھے یوں لگا جیسے کسی بڑے بوڑھے کو جسے نہ نظر آتا ہو اور نہ سنائی دیتا ہو اس کا کوئی عزیز کاندھے سے ہلا کر کہے "تمہارا حال پچھنے پئے نیں" (آپ کا حال پوچھ رہے ہیں)

تاہم کچھ دیر بعد مسٹر اسٹیفن سے مزید حال احوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ

اب "ڈائریکٹ ڈائیلنگ" سسٹم کے تحت براہ راست گفتگو ہو رہی تھی مس گیلینا سے بہت ساری دوسری باتوں کے علاوہ ایک بات میں نے یہ بھی پوچھی کہ سوشلسٹ معاشرے میں مزاح نگار کن چیزوں کو اپنے مزاح کا ہدف بناتا ہے۔ نیز یہ کہ اسے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ معلوم ہوا کہ سوشلسٹ معاشرے میں مزاح نگاروں کو اظہار کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ ٹرانسپورٹ کے ناقص نظام پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ صحت و صفائی کے موضوعات پر پوری بے باکی سے لکھ سکتے ہیں۔ دفتروں کی ناقص کارکردگی پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ اور یوں ان معاشروں میں "صحت مند" تنقید پر کوئی قدغن نہیں۔

گفتگو اور ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مس گیلینا سے کہا "مسٹر اسٹیفن سے میری طرف سے معذرت کیجئے کہ ان سے زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی۔ نیز انہیں میرا سلام بھی کہیں!"

مس گیلینا نے بلغارین زبان میں میرے جذبات ان تک پہنچائے مگر مجھے اس دفعہ پھر یہی لگا جیسے وہ انہیں کاندھوں سے جھنجوڑ کر کہہ رہی ہو "تمہانوں سلام کہہ رہے نیں" (آپ کو سلام کہہ رہے ہیں!)

میں ریستوران سے نکل کر واپس اپنے کمرے میں جانے ہی کو تھا کہ سید ضمیر جعفری راستے ہی میں مل گئے میں سمجھا تھا کہ وہ رات کو دیر سے مشاعرے سے لوٹیں تو صبح اٹھتے بھی دیر سے ہوں گے ایک سردار جی سے اس کے باس نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم روزانہ لیٹ دفتر آتے ہو؟" سردار جی نے جواب میں کہا "سر آپ کو صحیح اطلاع ملی ہے کہ میں دفتر لیٹ آتا ہوں مگر جناب میں جاتا بھی تو سب سے پہلے ہوں" ضمیر صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ اگرچہ رات کو دیر سے آئے تھے مگر صبح وہ مجھ سے بھی پہلے بیدار ہو گئے تھے چنانچہ نماز پڑھ کر اور ڈائری لکھ کر اب میری تلاش میں نکلے تھے تاکہ اکٹھے ناشتہ کر سکیں!

"تم نے ناشتہ کر لیا ہے؟" ضمیر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے کر لیا ہے؟"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"نہیں!"

"تو بس پھر یہی سمجھیں کہ میں نے بھی نہیں کیا" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"تو چلو پھر پہلے ناشتہ کرتے ہیں یہ کہہ کر ضمیر صاحب نے اس ریستوران کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جہاں عزیزہ گیلینا اور بزرگوار اسٹیفن خلق خدا کا کلیجہ "ساڑنے" کے لئے بیٹھے ہوئے تھے!

میں نے ضمیر صاحب کو روک لیا "اس ریستوران میں ناشتہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔ دیسی ناشتہ والے ریستوران میں چلتے ہیں!"

دیسی ناشتے والے ریستوران میں مسز پردھان ماتھے پر بندیا لگائے ساڑھی میں ملبوس اپنی سدا بہار مسکراہٹ کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں انہوں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد اب ہمارا پروگرام تاریخی مقامات کی سیاحت کا تھا چنانچہ غیاث متین' قدیر زمان اور علی الدین نوید ہمیں گھمانے پھرانے کے لئے گاڑی لے کر پہنچ چکے تھے!

تاریخ کے جھروکے سے

اور یہ گولکنڈے کا قلعہ ہے کار ایک مین گیٹ سے داخل ہوتی ہے اور ایک لمبی مسافت طے کر کے کہیں بہت آگے جا کر قلعہ آتا ہے اس درمیانی راستے میں دونوں طرف قطب شاہی بادشاہوں نے اصطبل بنائے ہوئے ہیں شہنشاہیت کے دور میں یہاں گھوڑے بندھے ہوتے تھے جمہوریت کے دور میں یہاں انسان رہتے ہیں قلعے کے دروازے میں داخل ہو کر اگر اس کے گنبد کے عین نیچے کھڑے ہو کر تالی بجائیں تو اس کی آواز آٹھ سو فٹ بلندی پر واقع بالا حصار میں جاتی ہے وطن سے آئے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے چنانچہ میں گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر کافی دیر تک تالیاں بجاتا رہا کیونکہ آؤٹ آف پریکٹس ہو جانے سے انسان بہت پیچھے رہ جاتا ہے! یہ قلعہ اپنی ساخت میں ملتان کے قلعے سے مشابہت رکھتا ہے بلکہ ملتان

کے قلعے کو بھی غالباً" بالا حصار ہی کہتے ہیں! قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے اور کھنڈرات بھی دیکھے قلی قطب شاہ تو ہمارا اپنا آدمی ہے سو اس کا مقبرہ زیادہ محبت سے دیکھا۔

اور اب ہم سالار جنگ میوزیم میں ہیں یہ میوزیم دیکھ کر زبان سے بے ساختہ "اللہ اکبر" نکل جاتا ہے نہایت قیمتی ہزاروں نوادرات پر مشتمل یہ میوزیم صرف ایک شخص یعنی نواب سالار جنگ کے ذاتی ذوق کا مرہون منت ہے میوزیم کا تقریباً چوتھائی حصہ ایسا ہے جو نواب صاحب کو خاندانی میراث کے طور پر ترکہ میں ملا ہے اس سے قطع نظر باقی سب سامان نواب صاحب کی ذاتی خرید ہے نواب صاحب نے کروڑوں روپے ان نوادرات پر خرچ کئے تاہم یہ میوزیم نری دولت کا کھیل نہیں نواب سالار جنگ کی خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے!

مکہ مسجد کئی لحاظ سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے ماضی قریب یعنی قریباً" نوے برس قبل یہاں ایک معرکہ بھی ہو چکا ہے جب سلطان نواز جنگ کی سرکوبی کے لئے مسجد کی چھت پر توپ نصب کی گئی جہاں سے سلطان نواز جنگ کا پورا گھرانہ تباہ کیا جا سکتا تھا وہ تو خیر ہوئی کہ سلطان نواز جنگ صاحب جنگ سے باز رہے ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے مکہ مسجد میں ایک پتھر ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ اس پر بیٹھنے والا شخص دوسری بار حیدر آباد ضرور آتا ہے میرا ارادہ اس پتھر پر بیٹھنے کا تھا مگر پھر سوچا کہ کہیں محض میری وجہ سے یہ روایت مشکوک نہ ہو جائے کیونکہ قسمت کا بہت "دھنی" ہوں!

مکہ مسجد کے گرد و نواح میں واقعہ "چار مینار" بالکل لاہور کی چوبرجی جیسا ہے صدیوں پرانے اس "چار مینار" کے قرب و جوار میں طوائفیں بھی آباد رہی ہیں ان میں سے ایک ماہ لقابائی چندا بھی تھی جو حیدر آباد کی ایک ممتاز مغنیہ ہی نہیں عمدہ شاعرہ حاضر جواب اور بہت بذلہ سنج بھی تھی اس کا ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس کی نگرانی کے لئے ایک بزرگ ملازم تھے جنہوں نے اسی کتب خانے سے استفادہ کر کے ایک تاریخ "ماہ نامہ" لکھی جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بل ادا کرنے والا مہمان

اس اثناء میں بھوک چمک اٹھی چنانچہ غیاث متین کی "قیادت" میں ضمیر صاحب میں اور علی الدین نوید ان مقامات کی قید سے آزاد ہو کر "نیاگرا ہوٹل" میں کھانا کھانے داخل ہو گئے قدیر زمان اجازت لے کر پہلے سے رخصت ہو چکے تھے سامنے والی میز پر بیٹھی تین بیبیاں بہت خواہش مند تھیں کہ ہم ان کی میز پر کھانا کھائیں یا انہیں اپنی میز پر بلالیں اور اس کا اظہار انہوں نے پہلے آنکھوں کے جلی اشاروں اور اس کے بعد ہاتھوں کے خفی اشاروں سے بھی کیا مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان مہربان "مہمانوں" کی "میزبانی" قبول نہ کر سکے چنانچہ بامر مجبوری انہوں نے ریستوران میں موجود کچھ دوسرے شرفاء کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہم نے تو حاتم طائی کے بارے میں سنا تھا کہ اس کے دسترخواں پر جب تک تین چار مہمان جمع نہیں ہوتے تھے وہ کھانا نہیں کھاتا تھا مگر یہ خوش خلق بیبیاں تو مہمانوں کا انتظار کئے بغیر مسلسل کھانے میں مشغول تھیں تا آنکہ کوئی بل ادا کرنے والا مہمان انہیں میسر نہیں آ گیا!

"اب کیا کیا جائے؟" ضمیر صاحب نے کھانے سے فراغت کے بعد سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیٹھا کھایا جائے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تے فیر کھواؤنا!" (تو پھر کھلائیں نا!) ضمیر صاحب نے ایسے مواقع کے لئے مخصوص باریک سی آواز نکالتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں کہا بالکل اسی طرح جیسے کوئی معصوم سا بچہ کھلونا ملنے کے وعدے پر مچل جائے اور لاڈ کے انداز میں کہے "پھر لے کر دیں نا!"

پیٹھا کھا کر ہم نے تھوڑی سی شاپنگ کی اس دوران ضمیر صاحب کی آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی میں نے کہا "ضمیر صاحب! لگتا ہے آپ کو نیند آ رہی ہے"

کہنے لگے "ہاں آ تو رہی ہے"

میں نے کہا "آپ نے سونا ہے یا تھانے جانا ہے؟"

"کیا مطلب؟" ضمیر صاحب نے بوکھلا کر کہا "یعنی تم کہنا کیا چاہتے ہو" ان کی آنکھوں

سے نیند اڑ گئی تھی اور اب وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"صبح ہم نے بمبئی جانا ہے قواعد و ضوابط کے مطابق ہمیں چوبیس گھنٹے پہلے تھانے جا کر اپنا ڈیپارچر لکھوانا چاہئے بصورت دیگر پانچ سال قید ہو سکتی ہے نیز یہ کہ ——"

اور اب ہم معزز مہمان اپنے میزبانوں کے ساتھ تھانے میں حاضر تھے مگر اس دفعہ جلدی جان بخشی ہو گئی اب شام کے چھ بجنے کو تھے یہاں سے ہم نے سیدھا "حلف" (حیدر آباد لٹریری فورم) کی تقریب میں شرکت کے لئے جانا تھا مگر سوچا ہوٹل سے ہوتے جائیں تاکہ سند رہے گو یہ سند بوقت ضرورت بھی کام آنے والی نہیں تھی!

شہر خوباں میں آخری رات

"حلف" (حیدر آباد لٹریری فورم) غالباً حیدر آباد کی سب سے سوقراطی تنظیم ہے' جو پروفیسر مغنی تبسم کی سرگردگی میں جدید حیت (ماڈرن سینسبلٹی) کے حامل لکھنے والوں کے گروہ پر مشتمل ہے' اس کے سرکردہ ارکان اور عہدیداروں میں غیاث متین' یوسف اعظم' قدیر زمان اور دوسرے دوست شامل ہیں' سو اس وقت ہم "حلف" کی طرف سے دیئے گئے استقبالیے میں شریک ہیں۔ تقریب ایک سکول یا کالج کی عمارت میں منعقد ہو رہی ہے' ادب سے لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ کرسیاں تو بھری ہوئی ہیں ہی' بہت سے لوگ دیواروں کے ساتھ بھی لگے کھڑے ہیں' صدارت مجتبیٰ حسین کر رہے ہیں' غیاث متین مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں' ضمیر جعفری کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا "کم کہا کہ وہ تو ہمارے مزاحیہ ادب کے ستونوں میں سے ہیں مگر اپنے بارے میں غیاث متین کی زبان سے جو سنا' اس سے ایک بار پھر حیدر آباد والوں کی مہمان نوازی کا قائل ہونا پڑا۔ میں نے یہاں نثر کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جب کہ ضمیر صاحب نے "حالا شعر من بشنو" کہا اور لوگوں کی فرمائش پر پے در پے کئی نظمیں سنائیں' بلکہ وہ اسی چکر میں اپنی ایک دو سنجیدہ غزلیں بھی سنا گئے اور ان کی یہ سنجیدہ غزلیں بھی —— یہاں چل گئیں۔ ادب کے عام قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ضمیر صاحب غزل کے انتہائی خوب صورت شاعر ہیں۔ مگر ان کی مزاحیہ شاعری نے ان کے فن

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کا یہ پہلو دبا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ضمیر صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ان کی سنجیدہ چیزیں بھی سنیں' مگر یار لوگ ادھر آتے ہی نہیں۔ حیدر آباد میں ضمیر صاحب نے موقع غنیمت جانا اور جب تک سامعین سنبھلتے' ضمیر صاحب اپنا کام دکھا چکے تھے' آخر میں مجتبیٰ حسین نے اپنی صدارتی تقریر کی۔ موصوف کیا پکا سا منہ بنا کر سنجیدہ سنجیدہ سی باتیں کرتے رہے۔ میں جب کسی مزاح نگار کو اس پچوایشن میں پھنسا دیکھتا ہوں' تو اس پر اس کی تحریروں سے زیادہ ہنسی آتی ہے۔ اس وقت میں اسی کیفیت میں جلا تھا۔

استقبالیے کے بعد نریندر لوتھر کی طرف سے دیئے گئے عشائیے میں شریک ہونا تھا مگر میری طبیعت شام ہی سے کچھ بوجھل سی تھی اور اب رفتہ رفتہ گرانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اتنی محبت سے ترتیب دی گئی محفل میں شرکت سے محروم رہوں مگر میں نے محسوس کیا کہ میری علالت اس محفل کو بدمزہ کر دے گی' چنانچہ میں نے ضمیر صاحب سے کہا کہ وہ نریندر لوتھر تک میری دلی معذرت پہنچا دیں اور پھر حمایت اللہ'' مصطفیٰ کمال اور طالب خوندمیری لبے ہوٹل تک چھوڑنے کے لئے میرے ساتھ چلے آئے۔ یہ دوست کچھ دیر کمرے میں رہے اور پھر دعوت میں شریک ہونے کے لئے نریندر لوتھر کی طرف چلے گئے۔

یہ حیدر آباد میں میری آخری رات تھی۔ میں ایک گہری اداسی کی زد میں آگیا' کیسے کیسے خوب صورت شہروں سے جدا ہوا ہوں' واشنگٹن' شکاگو' دہلی' ایمسٹرڈیم' تہران' لکھنؤ' میونخ' نیو یارک' شارجہ' پیرس' کابل لیکن جدائی کی ''کیفیت'' صرف تین شہروں سے وداع ہوتے ہوئے محسوس کی' امرتسر جو میرا جنم بھومی ہے اور جب میں چار سال کا تھا' تو اس شہر سے جدا ہوا تھا مگر یہ شہر اب بھی میرے اندر زندہ ہے' استنبول جس کے ظاہری حسن سے زیادہ باطنی حسن کے سحر سے میں اب تک نہیں نکل سکا اور اب میں بہ نصیب حیدر آباد سے وداع ہو رہا تھا' ایک بار پھر وداع ہو رہا تھا ——

ضمیر کی تلاش

میری طبیعت خاصی مضمحل تھی' مگر میں اپنے بستر سے اٹھا اور رخت سفر باندھنا شروع کر دیا کہ علی الصبح اٹھ کر بمبئی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اچانک میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے ضمیر صاحب کا پتہ کرنے کے لئے ان کے کمرے میں فون کیا' مگر کسی نے فون نہ اٹھایا گویا وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نے استقبالیے پر فون کیا' تو مزید تصدیق ہوئی' خدا جانے مجھے ان لمحوں میں ضمیر صاحب کے بارے میں اتنی تشویش کیوں محسوس ہوئی کہ میں نے روزنامہ ''سیاست'' فون کر کے نریندر لوتھر کے گھر کا فون نمبر لیا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی' بجتی رہی' حتیٰ کہ ایک بوڑھی عورت نے فون اٹھایا اور آگے سے کہا تو یہ کہا کہ یہاں کوئی ضمیر صاحب نہیں ہیں اور نہ یہاں کوئی دعوت ہے۔ اب میری پریشانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی' ان لمحوں میں مجھے یوں لگا جیسے مجھ میں میرے اباجی کی روح حلول کر گئی ہے۔ جو میرے ذرا سے لیٹ گھر پہنچنے پر شدید مضطرب ہو جاتے ہیں' چنانچہ میں اس وقت ضمیر صاحب کی طرف سے اس طرح پریشان تھا جیسے ایک والد اپنے بیٹے کے لئے ہوتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر ''سیاست'' کو فون کیا اور ڈیوٹی پر موجود سب ایڈیٹر کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں' بس آتے ہی ہوں گے' مگر ایسے مواقع پر بھلا طفل تسلیوں سے بھی کچھ ہوتا ہے' چنانچہ میں نے پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا' حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ اب مجھ میں انتظار کی مزید تاب نہیں تھی۔ میں نے لباس تبدیل کیا' بوٹ پہنے اور اتنے بڑے شہر میں آدھی رات کو ضمیر صاحب کو تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا' ابھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ضمیر صاحب مسکراتے ہوئے سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میرے اندر کا جاگا ہوا ''والد صاحب'' اس وقت سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ان صاحب زادے کی سرزنش کو چاہ رہا تھا' مگر انہیں سامنے پا کر تھوڑی ہی دیر میں غصہ فرو ہو گیا' معلوم ہوا کہ دعوت نریندر لوتھر کے گھر پر نہیں تھی' ایک ہوٹل میں تھی' جہاں بیسیوں معززین شہر مدعو تھے' سو ان سے رخصت ہوتے ہوتے دیر

Optimized by www.ImageOptimizer.net

ہو گئی بعد میں ضمیر صاحب میری اس پریشانی پر بہت ہنسے' خود میں بھی ان کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا۔ زندگی میں بہت ساری پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں' جن پر بعد میں اسی طرح ہنسی آتی ہے اور اسی طرح زندگی میں بہت ساری خوشیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جن پر باقی ساری عمر نوحہ کرتے گزر جاتی ہے ——

یار تم تو اداس بھی ہوتے ہو!

صبح چھ بجے بیدار ہو کر ناشتہ کیا' ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ہمیں ائرپورٹ تک لے جانے کے لئے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ ساڑھے سات بجے ہم ائرپورٹ پہنچے' وہاں نریندر لوتھر' غیاث متین' یوسف اعظمی اور علی الدین نوید پہلے سے موجود تھے۔ آٹھ پچاس پر جہاز نے بمبئی کی لئے ٹیک آف کیا۔ میں کھڑکی میں سے اس شہر کو اور اس شہر میں آباد خوب صورت دوستوں کو رخصت ہوتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سید ضمیر جعفری نے میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھی تو بولے "یار تم تو اداس بھی ہوتے ہو؟" میں نے ضمیر صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ تو خود مجھ سے زیادہ اداس تھے۔ یہ اداسی اس شہر سے رخصت ہونے کی تھی' جو ابھی تک اپنی تہذیب کے پورے رچاؤ میں زندہ رہنے کی کوشش میں ہے' جب کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے شہروں کی تہذیبی نبضیں ڈوب چکی ہیں ——

بمبئی کی طرف

اب پھر وہی جہاز تھا اور ماتھے پر بندیا لگائے جہاز میں ادھر سے ادھر آتیاں جاتیاں سانولی سلونی ائیر ہوسٹسیں! مثنوی سحر البیان یاد آگئی۔

ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

تاہم اس میں سے دوسرا مصرعہ غالتو سمجھیں کہ ان دیویوں کے پاس دکھلانے کے لئے صرف آنکھیں تھیں جو وہ پانی مانگنے والوں کو دکھلاتی تھیں۔ یہ پانی مانگنے والے بزبان حال یہ مصرعہ بھی تو پڑھتے تھے جو انہوں نے کبھی کسی ٹرک پر لکھا دیکھا تھا۔

آیا ہوں بڑی دور سے پانی پلا مجھے

حالانکہ ان پیاسوں میں بھی زیادہ تر فن برائے فن کے قائل ہوتے ہیں۔ اور خاصے سست بھی ہوتے ہیں چنانچہ کنوئیں میں خود ڈول ڈالنے کی بجائے کنوئیں پر کھڑی دوشیزہ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ یہ شعر سن کر ان کے لئے کنوئیں سے ڈول نکالے گی اور انہیں پانی پلائے گی۔ اگر کوئی رحمدل دوشیزہ ایسا کرتی بھی ہے تو یہ اوک میں سے پانی گرانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر پیاسے کے پیاسے رہتے ہیں' سو ایسے معصوم اور بے ضرر عاشقوں کو آنکھیں دکھلانا اگرچہ زیادتی ہے لیکن اس میں بھی بہتوں کا بھلا ہو جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے مے کشید کرنا شروع کر دیتے ہیں' دو چار جام پیتے ہیں اور پھر پکوڑے کھا کر سو جاتے ہیں یہ فضائی دیویاں کچھ اسی قسم کی خدمت خلق میں مشغول تھیں اور میں سید ضمیر جعفری سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ پیٹھا کھائیں گے؟"

مگر ضمیر صاحب اس وقت ایک الو کے "پٹھے" کو دیکھ رہے تھے جو شراب سیخ پہ ڈالی' کباب شیشے میں

قسم کی حرکتیں کر رہا تھا۔ یہ میخوار تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے جہاز میں لڑکھڑاتا ہوا ادھر سے ادھر جاتا تھا اور جس پر گرنا ہوتا' اس پر جا گرتا تھا' اس دوران اندازے کی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

غلطی کی وجہ سے وہ ایک بارہ من کی دھوبن پر جاگرا حالانکہ یہی اندازے کی غلطی اگر اس بارہ من کی دھوبن سے ہوئی ہوتی تو موصوف کا "کھڑے کھلوتے" کریا کرم ہو جاتا۔

"یار ہم نے تو سنا تھا کہ انسان شراب انجائے کرنے کے لئے پیتا ہے لیکن اس بدنصیب کو دیکھو' شراب اسے انجائے کر رہی ہے" سید ضمیر جعفری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دراصل شراب کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اسے کون پی رہا ہے" میں نے جواب دیا۔

اس دوران جہاز نے دو چار ہچکولے کھائے اور اس کے ساتھ ہی دو چار چیخیں فضا میں گونجیں جن میں ایک چیخ برابر والی صف میں بیٹھے ایک مہاشہ جی کی بھی تھی جنہوں نے دھوتی کے پلو دو ٹانگوں میں سے گزار کر ان کی گانٹھ کمر والے حصے میں باندھی ہوئی تھی اور "سوواور" کے طور پر ماتھے پر سیندور کا لمبا سا تلک لگا کر موصوف بزعم خود دوسرے جنم کے لئے اپنی بہترین پوزیشن مستحکم کر چکے تھے مسافروں میں ریفرشمنٹ تقسیم کرتی فضائی میزبانوں کے ہاتھوں میں ٹرے پر دھری چائے کی پیالیاں بھی جلترنگ کی طرح بج اٹھیں۔ ایک دفعہ لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے ہمارے جہاز نے بھی کچھ اسی قسم کی حرکات کی تھیں چنانچہ میں نے اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے برابر میں بیٹھے یار عزیز گلزار وفا چودھری سے پوچھا تھا "یار! ہم کتنی دیر تک اسلام آباد پہنچ جائیں گے" گلزار نے ہاتھوں پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا "اگر پھاٹک کھلا ہوا تو اور آدھے گھنٹے تک اسلام آباد پہنچ جائیں گے"

مگر بمبئی ابھی دور تھا۔ حیدر آباد میں مسلسل رت جگوں کی وجہ سے دو ہفتوں کی نیند بھی "پینڈنگ" تھی چنانچہ جہاز کے ہچکولے میرے لئے خواب آور "جھونٹے" ثابت ہوئے اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی گئیں!

یہ تو دلیپ کمار ہے!

مجھے نیند میں یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ رہا ہے چنانچہ زلزلے کے ان جھٹکوں سے میری آنکھ کھل گئی' دیکھا تو ضمیر جعفری مجھے کاندھوں سے جھنجھوڑ رہے تھے اور بصورت گھڑیال اس غافل کو بتا رہے تھے کہ بمبئی آگیا ہے۔ حضرت سودا یاد آگئے۔

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید خدام ادب کہیں کھڑے ہوں اور ضمیر صاحب کو بتائیں کہ صاحب کی ابھی آنکھ لگی ہے مگر یہاں تو افراتفری کا سماں تھا' بھارت اور پاکستان میں جو چیزیں مشترک ہیں' ان میں سے ایک یہ افراتفری بھی ہے' خدا کا شکر ہے کہ کوئی بھی اچھی چیز ان دونوں ملکوں میں مشترک نہیں ہے' ایک اردو تھی' وہ بھارت میں ہندی کے مہاسبھائیوں کی نذر ہو گئی ہے اور پاکستان میں اردو کے مہاسبھائیوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے!

حیدر آباد دکن کی عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں ہم جس پروٹوکول کی زنجیر میں دو ہفتے بندھے رہے تھے' بمبئی کا سفر اس سے آزاد ہو کر کھلی فضاؤں میں سانس لینے کے لئے تھا۔ بمبئی میرے لئے نیا شہر تھا مگر ضمیر صاحب کے لئے نہیں اور انہوں نے بطور خاص اس امر کا اہتمام کیا تھا کہ کسی کو ہمارے آنے کی کانوں کان خبر نہ ہو' سو ہم سیٹیاں بجاتے ہوئے بریفنگ ہال سے باہر نکلے۔ پیشتر اس کے کہ ٹیکسی سٹینڈ کا رخ کرتے میری نظر ایک ہجوم پر پڑی مگر یہ ایسا ہجوم تھا کہ دم سادھے کھڑا تھا' بچپن سے مجمع سننے کا شوق ہے چنانچہ یہ سوچ کر کہ دیکھیں بمبئی کے مجمع باز کیسے ہوتے ہیں میں نے اس ہجوم کا رخ کیا' ضمیر صاحب بھی ساتھ ہو لئے دیکھا تو ایک خوبصورت شخصیت کا مالک باوقار انداز میں کھڑا ہے اور لوگوں سے دھیمے لہجے میں بات کر رہا ہے۔

"ارے بھئی یہ تو دلیپ کمار ہے" ضمیر صاحب نے پرمسرت لہجے میں کہا مجھے یقین نہ آیا۔ ایک لیجنڈ جسے دیکھنے کی خواہش میں پوری جوانی بیت گئی' زندگی کے کسی موڑ پر اس طرح اچانک سامنے آجائے تو آنکھوں پر بے اعتباری سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ ناممکن سی بات ممکن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں اور ضمیر صاحب آگے بڑھے اور دلیپ کمار سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہم پاکستان سے آئے ہیں" یہ سنتے ہی پہلے دلیپ کے مصافحے میں گرمجوشی آئی اور پھر یہ مصافحہ معانقے میں تبدیل ہو گیا۔

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"آپ پاکستان سے کب آئے آپ کا تعلق کس شہر سے ہے؟" لگتا تھا دلیپ کو اس ملاقات کی خوشی ہم سے زیادہ ہے۔

"ہم ابھی پہنچے ہیں۔ میرا تعلق لاہور سے اور ان کا اسلام آباد سے ہے۔ اور آپ کے لئے قتیل صاحب کا سلام بھی لائے ہیں" لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے قتیل صاحب نے واقعی کہا تھا کہ اگر دلیپ سے ملاقات ہو تو اسے میرا سلام کہیں۔

دلیپ نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور ضمیر صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ بمبئی میں میرے مہمان ہوں گے' میں ابھی بنگلور جا رہا ہوں' میں اپنے سیکرٹری کو ہدایات دے جاتا ہوں کہ وہ آپ کا خیال رکھے" میں اور ضمیر صاحب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان لمحوں میں ہمیں اس کے بڑا آدمی ہونے کا شک گزرنے لگا۔ بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اجنبیوں کو بغیر نفع نقصان کے ترازو میں تولے اتنی اہمیت دینا شروع کر دیں۔ ہم نے تو اپنا تعارف بھی نہیں کرایا تھا' ہم نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ پاکستان سے دلیپ کی اس محبت نے ہمارے دل موہ لئے مگر دلیپ کو "سودا" کافی منگا پڑتا ہے۔ پاکستان سے اس کی محبت کو بھارت سے دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے گھر پر چھاپے مارے جاتے ہیں۔ اس کے انکم ٹیکس کے کھاتے کھولے جاتے ہیں اور اسے قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والوں کو اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ایک سچا فنکار کسی انسان سے اس کی قومیت کی بنیاد پر نفرت نہیں کر سکتا خصوصاً" اس صورت میں جب اس "کعبے" سے دور کی نہیں' اس کی بہت قریب کی نسبت بھی ہو!

ضمیر جعفری جب کسی صاحب کمال سے ملتے ہیں تو اپنے کمال بھول کر ایک عام فین کی طرح اس کی بلائیں لینے لگتے ہیں' کچھ اسی قسم کی صورتحال میں میں نے دلیپ سے ضمیر صاحب کا تعارف کرایا جو ضمیر صاحب کو بالکل اچھا نہیں لگا لیکن دلیپ کے رویئے میں مزید گرم جوشی آگئی اور پھر یہی "سلوک" ضمیر صاحب نے میرے حوالے سے کیا' جس کے نتیجے میں دلیپ ہم سے کچھ اتنے شیر و شکر ہوئے کہ اگر ہم شوگر کے مریض ہوتے تو اتنی شیرینی کی تاب

نہ لا سکتے' اس دوران بنگلور کی فلائٹ اناؤنس ہو چکی تھی لیکن دلیپ کمار ہم سے گپ شپ میں مشغول رہے' جب بنگلور کی فلائٹ آخری دفعہ اناؤنس ہوئی تو دلیپ نے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور چلتے چلتے تاکید کی کہ ہم بمبئی میں ان کے ہاں ٹھہریں لیکن ہم نے اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد بتایا کہ بمبئی میں تین دن ہم ایک "آزاد پنچھی" کے طور پر گزارنا چاہتے ہیں اور پھر یہ خوبصورت شخص ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا!

مونا سکھ اور مونے مسلمان

جو ٹیکسی ڈرائیور ہمارے حصے میں آیا وہ مونا سکھ تھا' مونا سکھ وہ ہوتا ہے جس کی داڑھی نہ ہو (جس طرح ہم سب مونے مسلمان ہیں) اس سردار کو پاکستانی فلم مولاجٹ کے سارے ڈائیلاگ زبانی یاد تھے چنانچہ اس نے بمبئی کی سڑکوں پر سرپٹ گاڑی دوڑاتے ہوئے یہ ڈائیلاگ دہرانا شروع کئے' ہم نے بڑی مشکل سے شخص مذکور کو اس "دھمکی آمیز گفتگو" سے روکا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ مولاجٹ کے سحر سے آزاد ہوا تو اس نے گاڑی آہستہ کی اور کہا "مہاراج یہ تو میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ نے جانا کہاں ہے؟" میں نے عرض کیا "کسی شریفانہ سے ہوٹل میں لے جاؤ" یہ سنتے ہی اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "مہاراج آپ نے اگر بمبئی میں کسی شریفانہ ہوٹل میں ٹھہرنا ہے تو پھر آپ یہاں کرنے کیا آئے ہیں؟" بہت جینوئن سوال تھا' ضمیر صاحب تو بالکل سٹپٹا کر رہ گئے' بالآخر کچھ توقف کے بعد بولے "وہی کریں گے جو شرفاء درحقیقت کرتے چلے آئے ہیں" ایک مونے سکھ کو شرفاء کی حقیقت انہی لفظوں میں سمجھائی جا سکتی تھی' اب ضمیر صاحب اسے یہ شعر تو نہیں سنا سکتے تھے۔

خلاف شرع تو یوں شیخ تھوکتے بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

ٹیکسی ڈرائیور اور ماؤزے تنگ

اب بمبئی کا مونا سکھ تھا اور ہم تھے' اس نے بمبئی کی سڑکوں پر گاڑی دوڑانا شروع کی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

اور پھر دوڑاتا ہی چلا گیا' ہم نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اس سے پوچھیں "منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی" مگر وہ ہر بار اس کے جواب میں "ہور سناؤ پاکستان دا کیہہ حال اے؟" کہہ کر ہمارا سوال گول کر دیتا۔ ماؤزے تنگ نے کہا "دنیا بھر کے ۔۔۔ مزدور ایک ہو جاؤ" مگر اس کی آواز پر صرف دنیا بھر کے ٹیکسی ڈرائیوروں نے کان دھرا' چنانچہ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں' ٹیکسی ڈرائیور آپ کو ایک ہی برادری کے رکن محسوس ہوں گے' اپنی مرضی کی سواری اٹھانے والے' کرائے میں ڈنڈی مارنے والے اور لمبا پینڈا طے کرانے والے۔ اس وقت یہ مونا سکھ ہمیں لمبا پینڈا طے کرا رہا تھا' اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب وہ ایک سڑک سے تیسری دفعہ گزرا۔ میں نے کہا "سردار جی' کیا مسئلہ ہے؟" بولا مہاراج راستہ بھول گیا ہوں" میں نے کہا "بادشاہو! اگر راستہ بھولنا تھا تو بالوں اور پگڑی کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی' ان کی موجودگی میں راستہ بھولنے کا جواز تو موجود تھا!" اس پر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا "آپ لوگوں نے ہمارے بہت لطیفے مشہور کئے ہوئے ہیں۔ کوئی نواں تازہ لطیفہ یاد ہو تو سناؤ" بس سکھوں کی یہی ادا ہے جو مجھے بہت زیادہ پسند ہے کہ وہ خود پر ہنسنا بھی جانتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ اسے دو چار تازہ بہ تازہ لطیفے سناؤں مگر مجھے کنور مہندر سنگھ بیدی یاد آ گئے' موصوف ایک محفل میں ہم سے پرزور فرمائش کر کے سکھوں کے لطیفے سنتے رہے' جب ہمارے پاس اسٹاک ختم ہو گیا تو انہوں نے کہا "مہاراج اگر اجازت دیں تو اب ایک لطیفہ میں "مسلوں" کا بھی سناؤں؟" ہم دوستوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کیوں نہیں بیدی صاحب' ضرور سنائیں" اور پھر انہوں نے جو لطیفہ سنایا اس نے اگلے پچھلے سارے لطیفوں کا بدلہ چکا دیا۔ چنانچہ آج بھی جب کوئی سکھ جوابی لطیفہ سنانے کی کوشش کرتا ہے تو میں فوراً موضوع بدل کر پوچھتا ہوں "ہور سناؤ فیر بال بچیاں دا کیہہ حال اے؟" گو اس مونے سکھ سے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس کا مقصد ہمارا دھیان لمبے پینڈے سے ہٹانا تھا لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ آخر احتیاط میں کیا حرج ہے؟

فٹ پاتھوں پر رینگنے والی مخلوق

اس وقت ہم جس سڑک پر سے گزر رہے تھے' اس کے دونوں طرف فٹ پاتھوں پر ایک پوری بستی آباد تھی' سینکڑوں بچے' عورتیں' بوڑھے' جوان ان فٹ پاتھوں کے مستقل مکین تھے۔ یہ بے گھر لوگ ایک طویل عرصے سے ان فٹ پاتھوں پر زندگی بسر کر رہے ہیں' انہی فٹ پاتھوں پر شادیاں ہوتی ہیں' ایک فٹ پاتھ سے دوسرے فٹ پاتھ پر بارات جاتی ہے' انہی فٹ پاتھوں پر بچے پیدا ہوتے ہیں' جوان ہوتے ہیں' بوڑھے ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور پھر انہی فٹ پاتھوں سے ان کی ارتھی اٹھتی ہے۔ بھارت کا مراعات یافتہ طبقہ دو باتوں پر بہت فخر کرتا ہے۔ ایک اپنی جمہوریت پہ اور دوسرا بھارت کی اقتصادی ترقی پر۔ 1982ء میں دہلی جانا ہوا تو ممتاز ناول نگار اور رکن پارلیمنٹ جناب حیات اللہ انصاری نے میرے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرے برابر والی نشست پر محترمہ محمودہ بیگم تشریف فرما تھیں جو کشمیری نژاد ہیں اور اس زمانے میں اندرا گاندھی کے ناک کا بال سمجھی جاتی تھیں' انہوں نے ایمرجنسی کے خلاف میرے جذبات کو مزید مشتعل کرنے کے لئے اپنی جمہوریت کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیئے' پہلے میں انہیں طرح دیتا رہا مگر پھر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق میں نے کہا "بیگم صاحبہ! ہم ایک عرصے سے ایمرجنسی کے شکنجے میں پس رہے ہیں' ہم اس پر نادم ہیں اور اپنے ملک میں اس کے خلاف جدوجہد میں بھی مشغول رہتے ہیں' مگر آپ کی جمہوریت نے کلکتہ اور بمبئی کے فٹ پاتھوں پر پلنے والی مخلوق میں دن بدن اضافے کے علاوہ آپ کو کیا دیا ہے۔ آپ میرے مہمان کے طور پر پاکستان میں تشریف لائیں' اگر آپ کو کراچی سے پشاور تک ایک شخص بھی فٹ پاتھ پر زندگی گزارتا مل جائے تو میں آپ کی جمہوریت اور اس کی افادیت کا قائل ہو جاؤں گا!" اسی طرح ادیبوں کا ایک وفد پاکستان آیا تو اس کے ایک معزز رکن کی زبان سے ہر دوسرا فقرہ یہ روا ہوتا تھا کہ "ہم لوگ سوئی سے جہاز تک خود بناتے ہیں آپ کیا بناتے ہیں؟" حتیٰ کہ میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے عرض کیا "آپ کا پریس پراپیگنڈہ کرتا ہے کہ ہم نے ایٹم بم بنا لیا ہے' اگر یہ درست ہے تو کل کلاں ہم

Optimized by www.ImageOptimizer.net

انشاء اللہ سوئی بھی بنالیں گے!" دنیا کی "عظیم" جمہوریت اور بزعم خویش "سپرپاور" بھارت کے شہر بمبئی کے فٹ پاتھوں پر کیڑوں کی طرح رینگتے انسانوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مراعات یافتہ طبقہ جمہوریت کے نام پر جمہور کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے؟

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

مونے سکھ کو غالباً "اب ہم پر ترس آگیا تھا کیونکہ قریباً" ایک گھنٹے کی مٹرگشت کے بعد اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے باہر کھڑی کی۔ میں نے ضمیر صاحب سے کہا آپ گاڑی میں بیٹھیں میں ذرا جائزہ لے کر آتا ہوں۔ یہ ایک خوشنما ہوٹل تھا' فور اسٹار کی لگ رہتا تھا مگر "جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے" والا منظر تھا' لیکن یہ "تو" تصوف والا نہیں بلکہ "من و تو" والا "تو" تھا جس پر ازل سے "تو تو میں میں" ہوتی چلی آرہی ہے۔ ہوٹل کی لابی مشکوک قسم کی عورتوں سے بھری ہوئی تھی اور دلال قسم کے مرد گاہکوں کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔ عورت کو جنس بازار بنانے والا کلچر ان دنوں پوری دنیا پر غالب ہے' اس کلچر کو نیچا اسلام نے دکھایا تھا اور یا پھر سوشلزم نے۔ سوشلزم میدان چھوڑ گیا ہے اور مسلمان ایمان چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ہوٹل کی فضا کچھ ایسی تھی کہ لگتا تھا یہاں رہائش رکھنے والوں کے لئے یہ "سہولت اختیاری نہیں" بلکہ لازمی قرار دی گئی ہے اور ضمیر صاحب کو اس امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں باہر نکل آیا اور ڈرائیور سے کہا "یہ جگہ مناسب نہیں' کہیں اور چلو" مونے سکھ نے جس دوسرے پھر تیسرے اور پھر چوتھے ہوٹل کا راستہ دکھایا وہ دیکھ کر پہلے ہوٹل کی یاد بہت ستائی۔ بالآخر میں نے کہا "یار' اس علاقے میں شریفانہ ہوٹل کوئی نہیں؟" اور پھر وہ ہمیں ایک شریفانہ ہوٹل میں چھوڑ گیا۔ اس کا مالک بھی ایک سکھ تھا۔ شلوار کرتے میں ملبوس "باریش' خاصا متقی لگتا تھا۔

بمبئی یا بنکاک

یہ جوہو کا علاقہ تھا۔ ہوٹل کے کمرے صاف ستھرے تھے اور کرایہ غالباً" پانچ سو روپے

یومیہ! میں اور ضمیر صاحب نہادھو کر اور کپڑے بدل کر ابھی اپنے بستروں میں دراز ہوئے ہی تھے کہ کسی نے دروازہ "ناک" کیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک شریمتی جی کھڑی تھیں وہ بھی نہادھو کر اور صاف کپڑے پہن کر آئی تھیں۔

"فرمایئے؟" میں نے پوچھا۔

"نمستے" انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ پھر ان کی نظر میری شلوار قمیص پر گئی اور غلطی کا احساس ہونے پر انہوں نے ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے کہا "سلام"

"وعلیکم سلام" فرمایئے!" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"کوئی سیوا ہو تو بتائیں" شریمتی جی نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"کون ہے بھئی' کیا بات ہے؟" ضمیر صاحب نے بستر پر لیٹے لیٹے مجھ سے پوچھا۔

"ایک دیوی جی ہیں' کہتی ہیں کوئی سیوا ہو تو بتائیں"

"شیوا جی؟" ضمیر صاحب نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا "بھئی انہیں کہیں ہم مہمانوں کو شیوا جی سے کیوں ڈراتی ہیں اور انہیں باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم والا ترانہ بھی سنائیں۔ اور ہاں دروازہ بند کر کے اب آجائیں یا پھر درمیان میں سے ہٹ جائیں"

میں نے ضمیر صاحب کی پہلی ہدایت پر عمل کیا۔

"یار یہ عجیب لوگ ہیں" ضمیر صاحب نے کہا انہوں نے تو بمبئی کو بنکاک بنا دیا ہے اور ہوٹل کا مالک دیکھو" اتنی بڑی داڑھی رکھی ہوئی ہے اور کرتوتیں....."

مگر ضمیر صاحب نے اس کے جواب میں جواب جاہلاں والی خاموشی اختیار کی!

"اور ہاں مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا" میں نے ضمیر صاحب کو مخاطب کیا "ہم معززین نے ابھی تھانے جا کر رائیول رپورٹ لکھانی ہے" بصورت دیگر پانچ سال قید سخت اور....."

"لاحول ولا قوۃ!" ضمیر صاحب نے بستر سے چھلانگ لگائی "باقی کام بعد میں ہوں گے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

پہلے اس سے فارغ ہو لیں"

بمبئی پولیس کے ارکان قدرے بھلے مانس نکلے' انہوں نے ارائیوں لکھ کر ہمیں چشم زدن میں فارغ کر دیا۔ مگر سید ضمیر جعفری کو یہ فراغت غالباً راس نہ آئی' انہوں نے پاسپورٹ سمیٹتے ہوئے پولیس آفیسر سے کہا "آپ قمر جلال آبادی کو جانتے ہیں؟" مرہٹے پولیس افسر کی بلا جانے یہ قمر جلال آبادی کیسے ہوتے ہیں' پیشتر اس کے کہ وہ مجرموں کی فہرست میں اس کا نام تلاش کرتا' ضمیر صاحب نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ لئے اور فوراً کہا "قمر جلال آبادی صاحب شاعر ہیں"

"شاعر؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ خاصا مشکل سوال تھا اور یہ سوال اگر کسی شاعر سے کیا جائے تو اس کی اپنی مشکلات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر ضمیر صاحب بالآخر اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گئے کہ شاعر کیا ہوتا ہے؟ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے' وہ بیچارا پولیس افسر تو ضمیر صاحب کے دوسرے استفسار پر انہیں یہ بھی نہ بتا سکا کہ پینٹھا کس دکان سے مل سکتا ہے کہ اسے ٹیٹھے کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں تھا۔ البتہ اس نے اپنی معلومات میں اضافے کی غرض سے یہ ضرور پوچھا کہ شاعر اور ٹیٹھے میں کیا فرق ہے؟ اس پر ضمیر صاحب خاصے آزردہ ہوئے اور اس قوم کے افراد کے بارے میں خاصی مایوسی کا اظہار کیا جس کے افراد شاعر اور ٹیٹھے میں موجود باریک سے فرق سے واقف نہ ہوں!

پوچھنے میں کیا حرج ہے؟

پولیس سٹیشن سے باہر نکلے تو میں نے ضمیر صاحب کو پکڑ لیا اور کہا..... "پہلے آپ دہلی سے حیدر آباد تک اپنے سکول کے زمانے کے استاد کو تلاش کرتے رہے' اس میں کامیاب ہوئے تو اب آپ کسی قمر جلال آبادی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں' یہ حضرت کون ہیں اور ایسی کون سی مصیبت آ پڑی ہے کہ بمبئی میں قدم رکھتے ہی آپ کو ان کی یاد ستانے لگی ہے؟"

فرمانے لگے "یہ میرا قیام پاکستان سے بہت پہلے کا دوست ہے' ہندو ہے' بمبئی میں رہتا ہے' یہ کیسے ممکن ہے کہ جس دوست کو میں نے پچاس سال سے نہیں دیکھا' اسے دیکھے بغیر بمبئی سے چلا جاؤں؟"

"آپ کے پاس اس کا ایڈریس ہے؟"

"آپ کو پتہ ہے بمبئی ایک شہر نہیں' چھوٹا سا ملک ہے؟"

"پتہ ہے"

"پھر آپ اسے کیسے تلاش کریں گے؟"

"تلاش کرنے میں تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے' اس کا ملنا نہ ملنا دوسری بات ہے!"

حسن "زن" سے حسن ظن بہتر ہے؟

اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ ہم پولیس سٹیشن سے نکلے تو ضمیر صاحب نے راہ چلتے لوگوں کو روک کر پوچھنا شروع کر دیا کہ تم قمر جلال آبادی کو جانتے ہو' انڈیا میں اردو کی جو حالت ہے' اس کے پیش نظر بمبئی جیسے شہر میں کسی اردو کے شاعر کی اس قدر عوامی مقبولیت کی توقع رکھنا ضمیر صاحب ہی کا کام تھا جو حسن ظن کے بادشاہ ہیں۔ حسن "زن" کی عدم موجودگی میں حسن ظن بہترین چیز ہے چنانچہ میں نے اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا اور ضمیر صاحب کے ساتھ ان کے دوست کی تلاش میں مشغول ہو گیا۔ اس طرح کی تلاش عموماً پاکستانی اور بھارتی فلموں میں کی جاتی ہے اور ان فلموں میں یہ تلاش سو فیصد صورتوں میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔

آپ کی طرح میں بھی ان پڑھ ہوں

اب ضمیر صاحب نے دیواروں پر لگے پوسٹر پڑھنا شروع کر دیئے تھے جو ہندی' انگریزی اور مقامی زبانوں میں تھے' اردو تو لکھنؤ اور دہلی سے غائب ہو گئی ہے' بمبئی میں کہاں "دستیاب" ہونا تھی' اچانک ضمیر صاحب کا چہرہ خوشی سے کھلکھلا اٹھا۔ انہیں ایک اشتہار اردو

Optimized by www.ImageOptimizer.net

میں نظر آگیا تھا اور یہ تھا بھی کسی مشاعرے کا۔ ضمیر صاحب جب وہ اشتہار پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مجھے محترم م۔ ش یاد آگئے' ایک دفعہ وہ عینک کے بغیر ایک اشتہار پڑھنے کی کوشش میں تھے جب اس میں ناکام ہوئے تو انہوں نے ایک راہگیر سے درخواست کی کہ وہ انہیں یہ اشتہار پڑھ کر سنائے' اس پر راہگیر نے معذرت کی اور کہا "معافی چاہتا ہوں میاں جی' میں بھی آپ ہی کی طرح ان پڑھ ہوں" تاہم اپنے ضمیر صاحب اشتہار پڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور خاصے بدمزہ بھی ہوئے کہ شعراء کی فہرست میں ان کے دوست قمر جلال آبادی کا نام شامل نہیں تھا اور ویسے بھی یہ مشاعرہ ایک مہینہ پہلے ہو چکا تھا۔

"اگر آپ نے بمبئی میں بھی دوستوں ہی کو تلاش کرنا ہے تو پھر کیوں نہ اختر الایمان سے ملاقات کی جائے' اردو کا یہ صاحب طرز نظم نگار بمبئی ہی میں تو ہے!" میں نے تجویز پیش کی۔

میرا خیال تھا ضمیر صاحب "معاہدے" کی پاسداری کرتے ہوئے کہ بمبئی میں ہم کسی قسم کی ادبی سرگرمیوں میں "ملوث" نہیں ہوں گے' میری اس تجویز کی مخالفت کریں گے مگر وہ میری تجویز پہ کھل اٹھے کہ ایک دفعہ پھر ان کی رگ دوستی و رگ وضعداری پھڑک اٹھی تھی۔

واپس ہوٹل پہنچ کر ضمیر صاحب نے اختر الایمان صاحب کا نمبر گھمایا اور طرفین میں اظہار مسرت کے بعد طے پایا کہ کل شام اختر الایمان کے فلیٹ پر ملاقات ہو گی!

"اب کیا کیا جائے؟"

"اب ضروری ہے کہ استراحت فرمائی جائے کہ حیدر آباد دکن کی تھکن بدن میں سرایت کر چکی ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے؟"

ذخیرہ اندوزی گناہ ہے

اتنے میں کانوں میں عربی کے کلمات سنائی دیئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مبلغ کفرستان ہند میں کسی گم کردہ راہ کو منزل کی طرف بلا رہا ہے۔ میں نے بیتابی سے اٹھ کر دروازہ کھولا' ایک عرب دو عدد دوشیزاؤں کو بغلوں میں دابے جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس

نے مجھے شلوار کرتے میں ملبوس دیکھا تو اسلامی اخوت کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے پوری قرات کے ساتھ مجھے سلام کیا' "السلام علیکم یا اخی!" مگر افسوس اس "ذخیرہ اندوز" کے دل میں اسلامی مساوات کا جذبہ بیدار نہ ہوا!

اداسی دور کرنے کا انتظام

دو گھنٹے کی نیند کے بعد بیدار ہوئے تو طبیعت پوری طرح بحال ہو چکی تھی' نہانے کے بعد تو یوں لگا جیسے جسم میں بجلیاں دوڑنے لگی ہیں چنانچہ میں نے احتیاطاً" ربڑ کے جوتے پہن لئے کہ حکماء کے نزدیک علاج سے پرہیز بہتر ہے۔

"یار' پاکستان کچھ زیادہ ہی یاد آرہا ہے" ضمیر صاحب نے پانی سے بھرے گلاس میں سے اپنی بتیسی نکال کر جبڑوں میں جماتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے سر' اس وقت اس قصے کو دراز نہ کریں' ورنہ میں رو دوں گا' میں بڑی مشکل سے ضبط کئے ہوئے ہوں!"

"میں جانتا ہوں' چنانچہ میں نے تمہاری اداسی دور کرنے کا انتظام کر لیا ہے!"

"وہ کیسے؟"

"تھوڑی دیر بعد تمہیں پتہ چل جائے گا.... آؤ میرے ساتھ!

سکھ ایک غیرت مند قوم!

ہوٹل کے باہر ٹیکسیاں کھڑی تھیں' زیادہ تر ڈرائیور سکھ تھے۔ سکھ بے حد جفاکش اور محنتی قوم اور بے حد غیور بھی ہے۔ دوستی کرنا بھی جانتی ہے اور دشمنی بھی۔ ان کے ہاں دشمن کو معاف کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ بعض مورخوں نے سکھوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لئے یہ کہانی گھڑی کہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں گورنر سرہند نے گورو گوبند صاحب کے دو نوعمر بیٹے دیوار میں زندہ چنوا دیئے تھے' سکھ اس جال میں آگئے اور اس کا ردعمل چار سو سال بعد 1947ء میں ظاہر ہوا۔ جنرل ڈائر نے 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بے گناہوں پر گولی چلائی اس سانحہ کے کئی سال بعد ایک سکھ نے لندن جا کر جنرل ڈائر کو جہنم رسید کیا۔ اندرا گاندھی نے سکھوں کے گولڈن ٹمپل کی توہین کی' اس کے محافظوں نے اسے گولی سے بھون دیا۔ اس پر سکھوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور ہزاروں بے گناہ سکھوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا' اس کے بعد راجیو گاندھی کی باری آئی' اگرچہ حتمی طور پر اس ضمن میں کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر گولڈن ٹمپل کی بے حرمتی کے بعد سکھوں کی طرف سے راجیو گاندھی کو بھی ہٹ لسٹ میں شامل کرنے کا اعلان کیا گیا تھا!

تو پھر ہندو کن کو مارتے رہے ہیں

جو سکھ ڈرائیور ہمارے حصے آیا وہ خالصتانی سکھ تھا' سکھوں کے قتل عام کا سانحہ تازہ تازہ تھا چنانچہ زخم بھی تازہ تھے۔ ہمارے ان دوستوں کو اب ہماری بات سمجھ آتی ہے کہ ہم اگر 1947ء میں الگ ہوئے تھے تو کیوں ہوئے تھے۔ جن سنگھی اور مہاسبھائی ذہنیت ایک ایک کر کے اقلیتوں کا جینا حرام کر رہی ہے' ہم اگر روز کے لڑائی جھگڑوں سے بچنے کے لئے الگ ہو گئے تو کیا برا کیا؟ اسے گاؤ ماتا کی تقسیم قرار دینا اور اکھنڈ بھارت کے نعرے لگانا امن کے خرمن کو آگ لگانے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟ بات کچھ سنجیدہ ہو گئی حالانکہ اندرا کے قتل کے رد عمل میں سکھوں کے قتل عام کے حوالے سے ایک دلچسپ بات سننے میں آئی جو میں اپنے قارئین کو سنانا چاہتا تھا۔ ایک کینڈین سکھ اس قتل عام کے بعد دہلی آیا تو دہلی کے کافی ہاؤس گیا' وہاں اس نے سکھ ادیبوں کی خیر و عافیت دریافت کی۔

"واہگرو کی کرپا سے وہ ٹھیک ٹھاک ہیں اور حسب معمول مشاعرے لوٹ رہے ہیں!

"لو تار سنگھ جج؟"

"وہ بھی خیریت سے ہیں"

"اپنے دلیپ سنگھ ہوری؟"

"وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں اور مزاح نگاری میں مشغول ہیں!"

اس کے بعد کینڈین سکھ نے بعض دوسرے سکھ ادیبوں کے بارے میں پوچھا اور جب اسے سب کے بخیریت ہونے کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا "اگر یہ سب خیریت سے ہیں تو پھر ہندو کن سکھوں کو مارتے رہے ہیں؟"

اپنی برادری کے درمیان

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے ضمیر صاحب سے کہا "آپ نے میری اداسی دور کرنے کا وعدہ کیا تھا' اس کا کیا بنا؟" ضمیر صاحب نے جواب دیا "یہ ٹیکسی اسی سلسلے میں حاصل کی گئی ہے!" اور پھر انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے بھنڈی بازار چلنے کے لئے کہا' حالانکہ وہ اس سے پہلے ہی منزل کا پوچھے بغیر' ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا یا اس گھوڑے پر سوار کرا چکا تھا۔ بھنڈی بازار میں پہنچ کر ہمیں یوں لگا جیسے ہم پاکستان میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف "میاں بھائی" یعنی مسلمان اپنی مخصوص وضع قطع میں نظر آ رہے تھے' یہاں دکانوں کے سائن بورڈ بھی اردو میں تھے۔ اگر کوئی آزاد خیال سے آزاد خیال مسلمان بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ملت سے اپنا ناطہ ختم کر دیا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں جو اذان دی گئی تھی' وہ زندگی کے آخری سانس تک اس کے وجود کے گنبد میں گونجتی ہے اور اسے اپنی طرف بلانے میں لگی رہتی ہے۔ جسٹس شاہ دین مرحوم مسلمانوں کے عظیم محسن تھے' ایک دن ان کے ہونہار فرزند میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" نے ان سے پوچھا کہ مذہب سے آپ کا تعلق برائے نام ہے' اس کے باوجود آپ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے ضمن میں اتنے بے چین کیوں رہتے ہیں؟ جسٹس صاحب نے جواب دیا "اس لئے کہ ملت اسلامیہ میری برادری ہے اور میں اپنی برادری کے دکھ سکھ سے الگ نہیں رہ سکتا" اس وقت میں اور ضمیر صاحب اپنی برادری کے درمیان تھے اور خوش تھے۔ ضمیر صاحب نے یہ انتظام صرف میری نہیں غالباً اپنی اداسی بھی دور کرنے کے لئے کیا تھا!

Optimized by www.ImageOptimizer.net

پورا بازار حاضر ہے جناب!

"کیا خیال ہے' پیٹ پوجا کا انتظام نہ کیا جائے' ایک ریستوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے ضمیر صاحب نے کہا.....

ضمیر صاحب کی طرف سے اداسی دور کرنے کی یہ دوسری مخلصانہ کوشش تھی۔

ہم ایک عوامی قسم کے ریستوران میں داخل ہو گئے' یہ اسی طرح کا ایک ہوٹل تھا جیسے کراچی میں ایرانیوں کے ہوٹل ہیں۔

سفید کرتے' سفید تہبند اور کپڑے کی سفید ٹوپی میں ملبوس ایک خشخشی داڑھی والا ویٹر کاندھوں پر صافی رکھے آرڈر لینے کے لئے میز پر جھکا اور پھر اس نے فر فر مینو کی گردان شروع کر دی۔

"بھنڈی ہے؟" میں نے اسے درمیان میں روک کر پوچھا۔

"پورا بازار حاضر ہے جناب" اس نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یار تم تو اپنے ہی قبیلے کے فرد لگتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟" ضمیر صاحب نے پوچھا۔

"عبدالرحمان" اس نے مختصر سا جواب دیا کہ اس کی نظر دوسرے گاہکوں پر بھی تھی!

تو پھر ایسے ہے کہ پہلے کہیں سے ایک پاؤ پیٹھا لاؤ دوسرے یہ بتاؤ کہ قمر جلال آبادی کہاں رہتا ہے اور تیسرے یہ کہ انسان اگر ارائیول رپورٹ لکھوانا بھول جائے تو اسے کتنے سال قید بامشقت کاٹنا پڑتی ہے؟"

مگر عبدالرحمان کے چہرے سے لگا کہ اس وقت اسے ضمیر کی اٹھکیلیاں اچھی نہیں لگ رہیں کہ اسے دوسری میز کے گاہک بے چینی سے کروٹیں بدلتے نظر آ رہے تھے! میں نے جلدی سے آرڈر دے کر اس کی مشکل آسان کر دی۔ شاید کبھی بھنڈی بازار والوں کی مشکل بھی آسان ہو جائے کہ مسلم کش فسادات میں بھنڈی بازار کی ہمیشہ شامت آتی ہے!

صحیح معنوں میں قائداعظم

میں اور ضمیر صاحب بہت دیر تک بے مقصد بھنڈی بازار میں مٹرگشت کرتے رہے۔

ضمیر صاحب ہولے ہولے مجھے قائداعظم کی دل میں اترنے والی باتیں سنا رہے تھے' قائد کی ذہانت' دیانت اور اہلیت کے حوالے سے بے شمار واقعات انہوں نے مجھے سنائے۔ انہیں قائد کی یاد شاید اس لئے زیادہ ستا رہی تھی کہ بمبئی قائد کا شہر ہے' ان کی باتیں سن کر میں سوچتا رہا کہ مسلمان کبھی اچھا لیڈر ثابت نہیں ہوا' ہندو نے اپنے رہنما گاندھی کو مغرب میں سچا بنا کر پیش کیا اور ہم اپنے قائداعظم کو مغرب والوں سے روشناس نہ کرا سکے۔ گاندھی جی یقیناً ہندوؤں کے بہت بڑے رہنما تھے اور ان کی زندگی کے بعض پہلو بہت خوبصورت ہیں لیکن گاندھی جی کی سیاست کو شکست دینے والے قائداعظم کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں ان کے قد کاٹھ کا بااصول رہنما نہ کوئی ان کے زمانے میں تھا اور نہ کوئی آج تک پیدا ہوا ہے! وہ صحیح معنوں میں قائداعظم تھے!

پھر وہی قمر جلال آبادی

اب جسم میں تھکاوٹ اترنا شروع ہو گئی تھی کہ حیدر آباد بمبئی کے ہوائی سفر کی "جیٹ لیگنگ" نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ واپس ہوٹل جانے کی ٹھانی۔ جب ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ہوٹل کے دروازے پر اتارا تو ضمیر صاحب جاتے جاتے رک گئے اور ڈرائیور سے پوچھا "تم قمر جلال آبادی کو جانتے ہو؟ اس کے فرشتے جانیں کہ قمر جلال آبادی کون ہے؟ چنانچہ اس نے انکار میں سر ہلایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے ضمیر صاحب نے کہا "یار فلم سے وابستہ معمولی سے معمولی ایکٹر کو لوگ جانتے ہیں مگر جو ان کے لئے گیت لکھتا ہے' اسے کیوں نہیں جانتے؟" اس دفعہ ضمیر صاحب صرف اپنے دوست کے لئے اداس نہیں تھے بلکہ انسانی معاشروں کی ترجیحات پر بھی اداس نظر آتے تھے' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا "بمبئی ایک بہت بڑا شہر ہے' جن تین چار لوگوں سے آپ نے قمر صاحب کے بارے میں پوچھا ہے' وہ اگر انہیں نہیں جانتے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں" یہ سن کر ضمیر صاحب کو کچھ اطمینان سا محسوس ہوا اور بولے "اگر یہ بات ہے تو پھر صبح ہم زیادہ لوگوں سے پوچھ کر دیکھیں گے۔ اور ایک بات یاد رکھو' میں اپنے دوست سے ملے بغیر بمبئی سے نہیں

Optimized by www.ImageOptimizer.net

جاؤں گا۔ خواہ مجھے ویزا میں توسیع ہی کیوں نہ کرانا پڑے!"

ادیب محبت کی کھوکھلی باتیں نہ کریں

اور پھر بمبئی میں ہمارا دوسرا دن طلوع ہوا۔ تیسرے روز میں نے اور ضمیر جعفری نے رخت سفر باندھنا تھا اور یہاں سے دہلی کے لئے کوچ کر جانا تھا جہاں سے لاہور بہت قریب ہے' لیکن کیا لاہور واقعی دہلی کے قریب ہے؟ دہلی سے بظاہر آدھ گھنٹے کی فلائٹ صدیوں کے فاصلے پر واقع ہے۔ 1947ء میں یہ فاصلے پہلے سے دو چند ہو گئے تاہم یہ فاصلے آج بھی کم ہو سکتے ہیں اگر مہاسبھائی ذہن پاکستان کے قیام کو گاؤ ماتا کی تقسیم سمجھنا ترک کر دے۔ اپنی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے اصولوں پر مبنی روابط قائم کرے اور مسئلہ کشمیر اور دیگر متنازعہ مسائل کو اپنی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے انہیں اصولوں کی بنیاد پر حل کرے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھارت علاقے کا تھانے دار بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دے' پاکستان کو نیپال' سری لنکا' بھوٹان نہ سمجھے کہ تعلقات اسی صورت میں بہتر ہو سکتے ہیں جب یہ برابری کی بنیاد پر ہوں۔ مجھے یہ بات بہت احمقانہ لگتی ہے کہ مسائل حل کئے بغیر محض ادیبوں اور ثقافتی وفود کے تبادلے سے تعلقات میں بہتری آ سکتی ہے بلکہ میرے نزدیک اس سے تعلقات میں مزید خرابی پیدا ہوتی ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ بھارت کو اپنی ادبی اور ثقافتی منڈی بنانے اور اپنی ذاتی لابنگ کے لئے اپنے بھارتی ہم زادوں سے جو گفتگو کرتے ہیں وہ تاریخی حقائق کے منافی ہوتی ہے چنانچہ بھارتی رائے عامہ ان موقع پرستوں اور مفاد پرستوں کو پاکستانی قوم کا نمائندہ سمجھتے ہوئے ننانوے فیصد پاکستانی عوام کے حقیقی جذبات سے بے خبر رہتی ہے اور یہ بات پاکستان اور بھارت کے تعلقات کے حوالے سے بہت نقصان دہ ہے۔ باہمی محبت کی مجرد باتوں مسائل پر گفتگو سے احتراز یا مسائل کے وجود ہی سے انکار' جو صورتحال پیدا کر سکتی ہے' اس کا خمیازہ دونوں طرف کے عوام کئی دہائیوں سے بھگت رہے ہیں۔ اگر آج متنازعہ مسائل حل ہو جائیں تو کھربوں روپے کا دفاعی بجٹ دونوں ملکوں کے عوام کی بہتری پر صرف ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس ضمن میں دونوں ملکوں کے ادیب اور دانشور نہایت مثبت کردار اختیار کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ محبت کی

کھوکھلی باتیں کرنے کی بجائے اسے محبت کی ٹھوس بنیاد فراہم کریں' اس کے لئے انہیں اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنا ہو گا۔ ذاتی مفادات پر برصغیر کے کروڑوں عوام کے مفادات کو ترجیح دینا ہو گی اور جس بات کو وہ سچ سمجھتے ہیں' اسے بغیر کسی خوف اور مصلحت کے کھل کر بیان کرنا ہو گا۔ کہ اسی میں ہم سب کا بھلا ہے!

جان لیوا معاہدہ

ضمیر صاحب کا دل پہلے اختر الایمان سے ملاقات کے لئے پسیجا تھا۔ صبح بیدار ہوتے ہی مجھے افتخار امام کی یاد آئی کہ یہ نغز گو شاعر بھی اسی شہر میں رہتا ہے۔ افتخار امام کا جریدہ "شاعر" بھارت کے موقر ادبی جریدوں میں سے ایک ہے اور پوری باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے' افتخار امام لاہور آئے تھے تو ان سے ملاقات رہی تھیں چنانچہ میں نے ضمیر صاحب سے کہا کہ بمبئی میں ادبی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے "معاہدے" کی خلاف ورزی تو ہو ہی چکی ہے' اب کیوں نہ افتخار امام سے بھی ملا جائے؟ ضمیر صاحب اندر سے اس "معاہدے" کے خلاف مجھ سے زیادہ بھرے ہوئے تھے چنانچہ ہم دونوں نے "مشترکہ اعلامیہ" جاری کیا کہ یہ ملاقات بہت ضروری ہے' نہ صرف یہ کہ بہت ضروری ہے بلکہ ابھی اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جائے سو ہم نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے پیلا بازار چلنے کے لئے کہا کہ "شاعر" کا دفتر اسی بازار کے قرب وجوار میں واقع ہے۔

بمبئی کا بدنام زمانہ پیلا بازار

قارئین کی "قیمتی" معلومات میں اضافے کے لئے عرض ہے کہ پیلا بازار بمبئی کے بازار حسن کا نام ہے اور بھارت کے علاوہ ارد گرد کے ممالک کو "ایڈز" یہیں سے سپلائی کی جاتی ہے' میں آپ کو 1985ء کے سفر کی روداد سنا رہا ہوں اس وقت صورتحال اتنی سنگین نہیں تھی لیکن آج بھارت میں ایڈز کے مریضوں کی تعداد تشویش ناک حد تک بڑھ چکی ہے اور بمبئی اس ہولناک مرض کا سینٹر ہے۔ نیپال میں تو ایڈز کو "بمبئی کی بیماری" کا نام دیا گیا ہے۔ بھارت

Optimized by www.ImageOptimizer.net

میں بے لگام جنسی آزادی جہاں بہت سے معاشرتی مسائل پیدا کر رہی ہے' وہاں یہ مرض بھی ایک صفریت کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ بھارتی حکومت اس کے سدباب کے لئے کوشاں ہے لیکن جب تک اس مرض کی "چھاؤنی" تباہ نہیں کی جائے گی' اس کا مقابلہ ممکن نہیں ہو گا۔

معاشرتی بیت الخلاء

اس بازار میں بہت رش تھا چنانچہ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل "شاعر" کے دفتر کی تلاش میں چل پڑے۔ ہمارے دائیں جانب وہ بدنام زمانہ "کھولیاں" تھیں جن میں چودہ سے ساٹھ سال تک کی دختران حوا تہذیب کے منہ پر کالک ملتی نظر آتی ہیں۔ "کھولی" اس لمبے سے کمرے کو کہتے ہیں جس میں قطار اندر قطار چارپائیاں بچھی ہوتی ہیں اور ہر چارپائی کے درمیان کوئی کپڑا لٹکا کر پارٹیشن کی جاتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں یہ کھولیاں بہت ملتی ہیں۔ منٹو طوائف کے انسٹی ٹیوشن کے خلاف نہیں' وہ اسے معاشرے کا ٹائٹ قرار دیتے ہوئے اسے برقرار رکھنے کے حق میں ہے جبکہ میرے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان کا ٹائٹ قرار دینا توہین انسانیت ہے' اس کی بجائے ان مجبوریوں اور محرکات کا خاتمہ کرنا چاہئے جو گوشت پوست کی مخلوق کو جنس بازار بناڈالتے ہیں!

حرام کھلاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

میں اور ضمیر صاحب جس بازار میں سے گزر رہے تھے' وہاں حوا کی بیٹیاں اپنی کھولیوں سے باہر جنس کا اشتہار بنی کھڑی تھیں' یہ طوائفیں بھی نہیں ٹکیائیاں تھیں' انہوں نے بھونڈا میک اپ کیا ہوا تھا وہ راہگیروں کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور ایسے جملے چست کرتی تھیں کہ "شرفاء" کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی تھیں' میں ضمیر صاحب سے باتوں میں مگن سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ اچانک بیس بائیس سال کی ایک دراز قد "دوشیزہ" نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور کھولی کی طرف کھینچنے لگی' میں نروس ہو گیا اور میری گھبراہٹ میرے چہرے سے کچھ اس درجہ نمایاں تھی۔ کہ اس نے اور ارد گرد کھڑی ٹکیائیوں نے کھڑکھڑ

ہنسنا شروع کر دیا' میں نے بے بسی سے ضمیر صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ ہنس رہے تھے' میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کی مگر مجھے یوں لگا جیسے میری قوت سلب ہو گئی ہو۔ "دوشیزہ" نے ہنستے ہوئے کہا "صرف بیس روپے کے لئے بازو چھڑاتے ہو' تم کیسے مرد ہو؟" میں نے اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا' جیب میں سے بیس روپے نکال کر اس کی نذر کئے اور رفتار تیز کر دی۔ مجھے ایک گندی گالی سنائی دی' میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا' اس نے بیس روپے ریزہ ریزہ کر کے زمین پر پھینکے اور پھر ان کاغذ کے ٹکڑوں کو پاؤں سے مسل دیا' اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصے کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی' اسے یوں لگا جیسے اسے خیرات دی گئی ہو جبکہ وہ "حق حلال" کی کمائی پر یقین رکھتی تھی' مجھے اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ شاید وہ کہہ رہی تھی "مجھے حرام کھلانا چاہتے ہو' تمہیں شرم نہیں آتی؟"

سادہ طرز زندگی

"شاعر" کا دفتر ایک پرانی سی بلڈنگ میں تھا جو پرانے بمبئی کے مخصوص فن تعمیر کا نمونہ تھی۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو افتخار امام ہمارے سامنے تھے۔ بہت تپاک سے ملے' چھوٹا سا دفتر اس سے ملحق رہائش گاہ! سادہ رہن سہن بھارتی عوام کی طرز زندگی میں داخل ہے' وہاں کا امیر طبقہ بھی ہمارے ہاں کے امیروں کی طرح دولت کی بے محابا نمائش نہیں کرتا۔ یہ ایک اچھی بات ہے اور ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہئے۔ افتخار امام رئیس نہیں ہیں میرے اور ضمیر صاحب ہی کی طرح سفید پوش ہیں بس فرق یہ ہے کہ ہم چادر سے باہر پاؤں پھیلا دیتے ہیں' وہ پاؤں چادر کے اندر ہی رہنے دیتے ہیں۔

پھر وہی ڈیپارچر

افتخار امام سے چائے کی پیالی پر گفتگو کے دوران اچانک ضمیر صاحب بوکھلا سے گئے۔

"بھئی عطامیاں مارے گئے!"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کیوں کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

"کل ہمیں دہلی کے لئے روانہ ہونا ہے!"

"تو اس میں مارے جانے والی کون سی بات ہے؟"

"ارائیول تو ہم لکھوا آئے تھے"

"تھانے جاکر ڈیپارچر تو ہم نے لکھوائی نہیں"

اس "معمولی سی بات" پر افتخار امام کو ہماری اس درجہ پریشانی کی کچھ سمجھ نہیں آئی' شاید اس لئے کہ انہیں اس معاملے میں غفلت کا علم نہیں تھا مگر انہوں نے کہا "آپ گھبرائیں نہیں' یہ مسئلہ ابھی حل ہو جائے گا!"

دیوانے کا خواب؟

اور پھر واقعی افتخار امام نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور پولیس آفس لے گئے۔ وہاں ان کے جاننے والے بھی مل گئے اور "ڈیپارچر" درج کرانے کا مسئلہ جلدی حل ہو گیا۔ بھارتی مسلمانوں میں ایک نئی چیز دیکھنے میں آ رہی ہے' وہ اب خود کو بھارت کا دو نمبر شہری نہیں سمجھتے یا اگر کوئی انہیں دو نمبر شہری ہونے کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ آگے سے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پولیس آفس میں اسی طرح کے دو تین مناظر دیکھنے کو ملے۔ بھارتی مسلمانوں کو اس "اکڑ" کا حق بھی حاصل ہے اور وہ اس لئے کہ آج تک کوئی مسلمان جاسوسی کے جرم میں ملوث نہیں پایا گیا۔ اکثریتی طبقے کے لوگ متعدد بار اس الزام میں پکڑے گئے ہیں اور انہیں سزا بھی ملی ہے لیکن ہندوؤں کا تنگ نظر طبقہ مسلمانوں کو غدار کہنے کے باوجود آج تک اپنے اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا۔ اس طبقے کی تنگ نظری کی وجہ سے پاکستان بنا پھر سکھ اس تنگ نظری کا نشانہ بنے اور ان میں علیحدگی پسندی کی تحریک پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوئی' اسی طرح مسلمان اقلیت کا جینا حرام کر دیا گیا ہے اور قیام پاکستان سے اب تک ہزاروں مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں جس میں پولیس اور فوج بھی بلوائیوں کا ساتھ دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھارتی مسلمان ابھی تک اس راستے کی

طرف گامزن نہیں ہوئے جس راستے کی طرف انہیں دھکیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ افتخار امام دوسرے بھارتی مسلمان دانشوروں کی طرح optimist ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک دن اس نفرت کا خاتمہ ہو جائے گا اور بھارت میں تمام مذاہب کے لوگ امن اور سکون کے ساتھ رہ سکیں گے' گو ابھی دور دور تک اس کے آثار نہیں ہیں لیکن خدا کرے امن و سلامتی کا یہ خواب جلد سے جلد پورا ہو۔

بمبئی — ایک خوبصورت شہر

پولیس آفس تک آنے اور جانے کے دوران بمبئی کی تیز زندگی کے مناظر دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت دفتروں میں چھٹی ہو رہی تھی چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں خواتین و حضرات افراتفری کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھاتے اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو رہے تھے جو طویل فاصلوں پر واقع تھے۔ مرہٹی خواتین کے رنگ تانبے کی طرح ہیں اور وہ خاصی پرکشش ہیں۔ مغربی لباس بہت عام ہے چنانچہ دفتروں میں کام کرنے والی بیشتر لڑکیوں نے اسکرٹس پہنے ہوئے تھے۔ لوکل ٹرین میں بے پناہ رش تھا اور ٹرین کی حالت اتنی ہی خستہ تھی جتنی اس میں سفر کرنے والے مسافروں کی۔ بس اسٹاپوں پر بھی بے پناہ ہجوم تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر رشک آیا کہ وہاں دھکم پیل کے وہ مناظر مفقود تھے جو ہمارے ہاں نظر آتے ہیں بلکہ لوگ پورے سکون سے قطاروں میں کھڑے تھے اور اپنی باری پر بس میں سوار ہو جاتے تھے امریکن نیویارک کا نام ناک سکوڑ کر لیتے ہیں اور بھارت میں بہت سے لوگوں کو میں نے بمبئی اور کلکتہ کی فاسٹ لائف کے حوالے سے ناک بھوں چڑھاتے دیکھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے بمبئی بہت اچھا لگا یہ شہر چوڑائی کی بجائے لمبائی میں واقع ہے اور سمندر میں گھرا ہوا ہے' سمندر والے شہر مجھے ویسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ (میں سمندر کی بے تکلفی سے ڈرتا ہوں' اس لئے کبھی بحری جہاز میں سفر نہیں کیا) یوں بھی بمبئی کا جو "قابل نمائش" حصہ ہے وہ بہت خوبصورت ہے' پھر یہاں پر زبان اور ہر نسل کے لوگ آباد ہیں اور یوں مختلف ثقافتوں کے دلکش رنگ یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ شہر کچھ کچھ کراچی سے ملتا ہے۔ کراچی سے میری محبت کا یہ عالم ہے کہ جب یہ شہر بین الاقوامی

Optimized by www.ImageOptimizer.net

سازشوں کی وجہ سے اپنی رونقوں سے محروم ہوا اور وہاں امن اور آشتی کی ہواؤں کی بجائے روح کو جھلسا دینے والے جھکڑ چلنے لگے تو شدت غم سے میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا' خدا کا شکر ہے کہ آج یہ شہر دوبارہ اپنی خوبصورتیوں کی طرف لوٹ گیا ہے۔ خدا کرے خوبصورت شہروں کی خوبصورتیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔

یہ بیچارے بزرگ ہیرو!

اختر الایمان کے ساتھ ملاقات کے لئے شام کا وقت طے ہوا تھا اور یوں ہمارے پاس ابھی خاصا وقت تھا۔ ذہن میں یہ بھی تھا کہ کل سہ پہر کو واپسی ہے اور یوں سیاحت کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نہیں ملے گا چنانچہ افتخار امام سے رخصت ہو کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بمبئی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنگال ڈالا یا یوں کہہ لیں کہ کوشش کی کیونکہ بمبئی دیکھنے کے لئے ایک دن نہیں کم از کم ایک ہفتہ درکار ہے۔ بمبئی نگار خانوں کا شہر ہے۔ سارے بھارت سے ہیرو اور ہیروئن بننے کے شوقین لڑکے اور لڑکیاں اسی شہر کا رخ کرتے ہیں لیکن ہم نے اس خوف سے ان نگار خانوں کا رخ نہیں کیا کہ کہیں "ایں ہم بچہ شتراست" کہہ کر دھر نہ لئے جائیں اور پھر خواہ مخواہ کسی قلم کا ہیرو کا پارٹ ادا نہ کرنا پڑ جائے بلکہ ہیرو کے لئے مطلوبہ عمر کی شرط پوری کرنے کی وجہ سے میں تو لاہور میں شاہ نور اسٹوڈیو کے قرب و جوار میں رہائش رکھنے کے باوجود ادھر سے آنکھ بچا کر گزرتا ہوں کہ بھارت میں جیتندر' رشی کپور' جیکی شیروف اور پاکستان میں ندیم اور سلطان راہی ایسے بزرگوں کا "حشر" میرے سامنے ہے جن بیچاروں کو اس عمر میں نوخیز ہیروئنوں کے ساتھ ہیرو کا پارٹ ادا کرنا پڑتا ہے مجھ سے زیادہ تو ضمیر جعفری لرزاں و ترساں تھے' ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی ڈائریکٹر نے انہیں ہیرو بننے کی پیشکش کر ہی ڈالی تو وہ کیا کریں گے کہ آخر کفران نعمت بھی تو کوئی اچھی بات نہیں؟

غداروں کی اولاد

میں نے اور ضمیر جعفری نے کچھ وقت میرین ڈرائیو پر گزارا۔ میرین ڈرائیو سمندر

کے ساتھ ساتھ کئی میل لمبی سڑک ہے جس کے کئی مقامات پر ہر وقت میلے کا سا سماں رہتا ہے۔ ابو ظہبی میں بھی "میرین ڈرائیو" یعنی اسی نوع کی سڑک موجود ہے مگر وہاں اسے "کارنش" کہتے ہیں۔ اس سڑک پر چہل قدمی کرتے اور "رونق میلہ" دیکھتے ہوئے یاد آیا کہ برٹش انڈین نیوی نے بمبئی کے ساحل پر "بغاوت" کی تھی' مسلمان ہندو اور سکھ سپاہیوں نے انگریز کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا یہیں اعلان کیا تھا جس کا آزادی ہند اور پھر قیام پاکستان کے ضمن میں بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آسکی کہ چند ہزار یا چند لاکھ غیر ملکی کس طرح کروڑوں کی آبادی کو قابو میں کر لیتے ہیں' مقامی آبادی اگر ڈنڈوں سے بھی ان پر حملہ آور ہو جائے تو ان کے سر کچل کر رکھ دے لیکن شاید یہ ممکن نہیں کہ انہی میں سے کچھ مفاد پرست اپنے گھٹیا مفادات کی خاطر قوم کی آزادی کا سودا کر ڈالتے ہیں۔ ایک اور بات میرے لئے ناقابل فہم ہے' وہ یہ کہ آزادی ملنے کے بعد ان غداروں کو سرعام پھانسیاں دینے کی بجائے انہیں یا ان کی اولاد کو تخت پر کیوں بٹھا دیا جاتا ہے؟ بھارت کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن ہمارے ہاں آزادی کے بعد سے انہی غداروں کی اولاد ہم پر حکومت کرتی چلی آرہی ہے۔ کیا اس بدصورت سیاسی منظر نامے میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی؟

بادشاہ کون

ایک جگہ سمندر کے درمیان ایک مزار نظر آیا جس پر سبز علم لہرا رہے تھے۔ یہ امام بخاریؒ کا مزار تھا۔ جو صدیوں پہلے عرب سے تبلیغ دین کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور پھر یہیں دفن ہوئے۔ اس وقت مزار تک جانے والا سمندر کا راستہ خشک تھا۔ روایات یہ مشہور ہیں کہ نماز کے اوقات میں سمندر کی لہریں زائرین اور نمازیوں کو راستہ دے دیتی ہیں۔ بہرحال زائرین ہزاروں کی تعداد میں مزار کی طرف رواں تھے۔ مزار کے باہر وہی منظر دیکھنے میں آرہا تھا جو تمام مزاروں کے ضمن میں مشترک ہے' وہی پھولوں اور سبز دستاروں کی دکانیں اور وہی فقیروں کی یلغار۔ ہم نے وہاں فاتحہ پڑھی اور ذہن میں یہ خیال بار بار ابھر کر سامنے آتا رہا کہ زمینیں فتح کرنے کے لئے آنے والے بادشاہوں اور دل تسخیر کرنے والے صوفیوں میں سے

Optimized by www.ImageOptimizer.net

بقائے دوام کے تخت پر کون بیٹھا نظر آتا ہے؟ یقیناً یہ مقام صوفیوں کو حاصل ہے جو اس وقت ہماری نظروں کے سامنے موجود نہیں ہیں لیکن ان کے پیغام کی کروڑوں نشانیاں پورے برصغیر میں پھیلی نظر آتی ہیں۔

"شیم اون یو"

بمبئی میں ٹیکسی پر "چہل قدمی" کرتے ہوئے ہم نے قائداعظم کا گھر بھی دیکھا حکومت پاکستان اس گھر کو میوزیم کے طور پر محفوظ کرنے کے لئے بھارتی حکومت سے کئی دفعہ مذاکرات کر چکی ہے لیکن ابھی تک اس ضمن میں شنوائی نہیں ہوئی۔ میں نے اور ضمیر جعفری نے ٹیکسی سے اتر کر اس گھر کو سلیوٹ کیا جس کے ایک نحیف و نزار شخص نے برصغیر کے کروڑوں بے نوا مسلمانوں کو ایک گھر دیا جس میں وہ سکون کی زندگی گزار سکتے لیکن اس گھر کے "منتظمین" نے ابھی تک یہ سادہ خواب پورا نہیں ہونے دیا' شیم اون یو ٹریٹرز

بنکوایٹ ہال

ضمیر جعفری ہمسفر ہی نہیں' گائیڈ بھی بہت اچھے ہیں۔ بمبئی کی سڑکوں پر سیر گشت کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی اور کہا "اونچائی پر واقع یہ میدان دیکھ رہے ہو' یہ پارسیوں کا مردہ گھاٹ ہے"

"مردہ گھاٹ' کیا مطلب؟"

"تم اسے قبرستان بھی کہہ سکتے ہو' پارسی یہاں اپنے مردے رکھ جاتے ہیں تاکہ چیلیں اور کوے اس سے اپنا پیٹ بھر سکیں"

"میں سمجھا نہیں"

"اس میں نہ سمجھ آنے والی کون سی بات ہے' ان کا خیال ہے کہ انسان اگر زندگی میں نہیں' تو مرنے کے بعد ہی کسی کے کام آئے چنانچہ وہ اپنے مردے چیلوں اور کوؤں کے آگے ڈال دیتے ہیں"

یہ سن کر مجھے پورے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی تاہم کچھ دیر بعد میں نے کہا "تو پھر اس مقام کو مردہ گھاٹ یا قبرستان کہنا مناسب نہیں' یہ تو چیلوں کا بینکوئٹ ہال ہوا"

ظہور راجہ کون ہے؟

"ضمیر جعفری نے ٹیکسی ایک عظیم الشان کوٹھی کے سامنے رکوائی۔

"یہ ظہور راجہ کی کوٹھی ہے"

"کون ظہور راجہ"

"تم اس کی کہانی سنو گے تو تمہیں یہ ایک داستانوی کردار لگے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ وجیہہ اور خوبصورت شخص نہیں دیکھا' یہ مری کا رہنے والا تھا فلم "سکندر" میں اس نے سکندر اعظم کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم "مرزا صاحباں" میں یہ مرزا بنا تھا۔ "انمول گھڑی" کی کہانی اور گانے اسی نے لکھے تھے۔ "تاروں کا کارواں ہے" والا گانا اسی کا لکھا ہوا ہے۔ اس داستانوی شخص نے زندگی میں سترہ شادیاں کیں۔ بمبئی کی بھی پری چہرہ ہیروئنیں اس پر مرتی تھیں۔ سورن لتا' مینا کماری' ممتاز' مینا شوری اور اپنے زمانے کی مقبول ترین دوسری ہیروئنیں اس کے "حرم" میں شامل تھیں۔ بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ بمبئی میں اس کے ریس کے اصطبل تھے' سر آغا خان اس کے ہاں مہمان ہوئے تھے۔ یہ کسی زمانے میں گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھا کرتا تھا' ایک ہندو رائے بہادر کی لڑکی کو اغوا کیا جس کے نتیجے میں بھاگ کر بمبئی آنا پڑا۔ یہ شخص اپنی زندگی میں لیجنڈ بن گیا تھا"

میں حیرت سے ضمیر صاحب کی باتیں سن رہا تھا "آج کل یہ شخص کہاں ہے؟"

"ان دنوں لندن میں ہے"

"وہاں کیا کر رہا ہے؟" مجھے ظہور راجہ سے شدید دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"گمنامی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے' جس شخص کی راہ میں لاکھوں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے' اب اس کی بے نور آنکھیں خلا میں گھورتی رہتی ہیں۔ اب اس کے پاس اچھے دنوں کی یاد کے سوا کچھ نہیں"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

کہانی کے اس موڑ پر پہنچ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ ایسا دھچکا جس سے پورا وجود ہلتا محسوس ہوا' میں نے سوچا کہ آج کے "ظہور راجہ" لمحہ موجود کو آخری حقیقت سمجھے بیٹھے ہیں اگر وہ ان لمحوں کی چاپ بھی سن لیں جو دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں تو شاید ان کی زندگی کا پیٹرن کچھ اور ہو لیکن ایسا پہلے کب ہوا ہے کہ اب ہو گا؟

اختر الایمان سے ملاقات

ہم بمبئی کی سڑکیں کافی ماپ چکے تھے۔ اس دوران اختر الایمان سے ملاقات کا ٹائم ہو چکا تھا۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور برصغیر کے اس ممتاز نظم گو شاعر کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے "فلیٹ" کے لفظ سے آپ کے ذہن میں ریواز گارڈن کے فلیٹس نہیں آنا چاہئیں' اختر الایمان کا فلیٹ بمبئی کے انتہائی مہنگے علاقے میں تھا اور خاصا کشادہ اور بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا' یہ بلندی پر واقع ہے اور یوں ان کے گھر کی کھڑکی سے بمبئی کچھ زیادہ ہی خوبصورت نظر آتا ہے۔

سفید پاجامے اور سفید کرتے میں ملبوس گہری گندمی رنگت کے حامل اختر الایمان ہمارے منتظر تھے' ان سے بہت دیر تک شعر و ادب کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ اختر الایمان پوری طرح مشرقی تہذیب سے وابستہ ہیں۔ ان کا لباس' ان کا رہن سہن اور ان کا بول چال کا انداز سب مشرقی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی سوچ اور بستی نظام الدین کے ایک عام مسلمان کی سوچ میں بہرحال ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی کہ دونوں کو بالکل مختلف حالات کا سامنا ہے۔ اور جہاں تک بین الاقوامی ثقافت میں پرورش پانے والی نئی نسل کا تعلق ہے۔ یہ تحریک شاید خود اختر الایمان ہی اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں کہ یہ اونٹ بالآخر کس کروٹ بیٹھے گا؟

"اختر الایمان دھیمے لہجے اور نہایت خوبصورت اردو میں باتیں کر رہے تھے میں نے سوچا کیوں نہ ان کی باتیں ریکارڈ پہ لائی جائیں چنانچہ میں نے انہیں "نوائے وقت" کے لئے انٹرویو پر آمادہ کیا اور پھر میں نے اور ضمیر جعفری نے ان کا طویل انٹرویو کیا جو نوائے وقت کے

ادبی ایڈیشن میں قریباً" پورے صفحے پر شائع ہوا۔ اختر الایمان کا باتیں کرنے کا انداز استاد لنشین ہے کہ جی چاہتا تھا یہ صحبت طویل سے طویل تر ہو لیکن کل دوپہر ہم نے بمبئی سے دہلی اور پھر دہلی سے پاکستان کے لئے روانہ ہونا تھا۔ رات بھی گہری ہو گئی تھی' سو ہم نے اس خوبصورت شاعر سے اجازت طلب کی اور واپس اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے!

آہو جی!

"دن بھر کی تھکن جسم میں ڈیرے ڈال چکی تھی چنانچہ اپنے بستر میں "داخل" ہوتے ہی ہم نیند کے ہتھے چڑھ گئے اور صبح جب آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے نہانے دھونے اور ناشتہ کرنے کے بعد جو وقت بچتا تھا اس میں ہم صرف ائیرپورٹ تک ہی پہنچ سکتے تھے۔ سو ہم نے یہ سب کام شتابی سے کئے' سامان ٹیکسی میں پھینکا اور ڈرائیور سے ائیرپورٹ چلنے کے لئے کہا۔ پیشتر اس کے کہ ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کرتا' ضمیر صاحب کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہوئے اور انہوں نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا "تم قمر جلال آبادی کو جانتے ہو؟"

"آہو جی" ڈرائیور نے خالص پنجابی لہجے میں جواب دیا۔

"واقعی؟" ضبط مسرت سے ضمیر صاحب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی جس کا اندازہ ان کے چہرے کی سرخی سے ہوا۔

"کیا تمہیں پتہ ہے وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"آہو جی" ڈرائیور نے اسی پرانے لہجے میں کہا۔

"یعنی تمہیں واقعی پتہ ہے کہ قمر جلال آبادی کہاں رہتے ہیں؟" ضمیر صاحب کو غالباً" یقین نہیں آرہا تھا۔

"باؤ شاہو' آپ کو وہاں لے جاتے ہیں' آپ کو خود ہی یقین آجائے گا" ضمیر صاحب اس وقت مزید بے یقینی کا شکار ہو گئے جب اس نے ہوٹل سے ذرا فاصلے پر ایک کٹڑی نما گلی کی ڈیوڑھی میں گاڑی داخل کر دی اور پھر انجن بند کر کے ایک پرانے سے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "قمر جلال آبادی کا گھر یہ ہے"

Optimized by www.ImageOptimizer.net

"ضمیر صاحب نے بے یقینی سے دروازے پر دستک دی' تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک معمر سا شخص بنیان اور دھوتی میں ملبوس نمودار ہوا یہ قمر جلال آبادی تھے۔ ضمیر جعفری نے بے تابی سے انہیں اپنے سینے کے ساتھ لپٹا لیا۔ بہت عجیب بات ہے کہ جس بزرگ کو ضمیر صاحب ڈھونڈ ڈھونڈ کر "پھاوے" ہو گئے تھے۔ اس میں وہ جوانی گرم جوشی نظر نہیں آئی۔ جس کی توقع تھی' ممکن ہے یہ میری غلط فہمی ہو اور ممکن ہے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے!

دلی دور است؟

"بمبئی سے ہمارے طیارے نے ٹھیک وقت پر پرواز کیا اور اب ایک دفعہ پھر ہم دہلی میں تھے' وہی **کنشکا** ہوٹل تھا اور وہی دوستوں کا شہر دہلی' جس میں ہمارے سفارت خانے کے اشفاق گوندل' مزاح نگار مجتبیٰ اور دلیپ سنگھ محقق اور نقاد ڈاکٹر خلیق انجم' شمس الرحمان فاروقی' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' شمیم حنفی' محمود ہاشمی' شارب ردولوی' حاجی انیس دہلوی' مخمور سعیدی' ذہین نقوی اور دوسرے متعدد دوست آباد ہیں یا ان کی وجہ سے دلی آباد نظر آتا ہے!

اگلے روز ہمارا طیارہ دہلی سے لاہور کی طرف رواں تھا۔ یہ فاصلہ ہم نے صرف چالیس منٹ میں طے کیا۔ پاک سرزمین کا ہوائی بوسہ لینے کے بعد میں نے ضمیر صاحب سے پوچھا "ضمیر صاحب کیا لاہور سے دلی واقعی دور ہے؟" ضمیر صاحب نے جیب سے چیونٹے کی ایک قاش نکالی اور اس کی "چسکیاں" لیتے ہوئے کہا "دلی ہم سے کیسے دور ہو سکتا ہے اور ہم دلی سے کیسے دور ہو سکتے ہیں' وہاں نظام الدین اولیاءؒ ہیں' یہاں داتا گنج بخشؒ ہیں اور اس کے علاوہ صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ ہے۔ دعا کرو ہم لوگ اپنے نئے گھروں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی آزادی کو تسلیم کریں اور اس کا احترام کریں۔ اس صورت میں دلی دل کے قریب ہے' ورنہ دلی دور است!"

Optimized by www.ImageOptimizer.net